

UNIVERSAL
LIBRARY

OU
188880

UNIVERSAL
LIBRARY

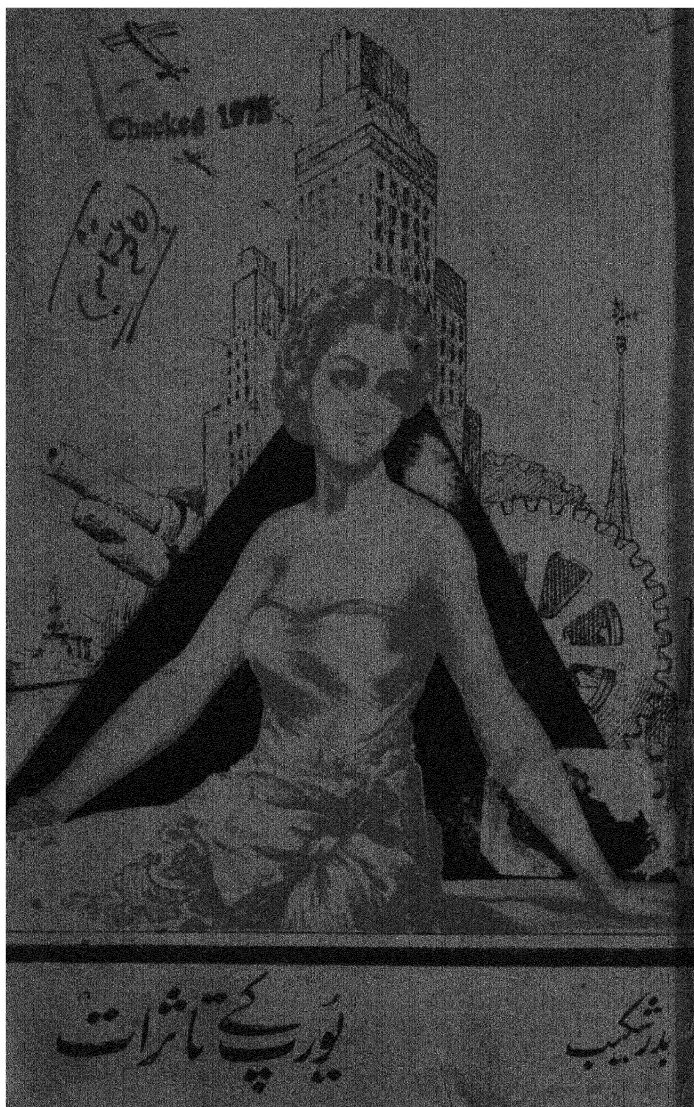
OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY
Checked 1977

Call No. 913 Accession No. 11851

Author B. S. Chatterjee

Title The Indian National Movement

This book should be returned on or before the date last marked below.



یورپ کے تاثرات

سول کتبیں
سید محمد القادر ریس
تاجران کتب چارسدہ

”یہ کتاب صرف حالات و واقعات اور شائدات
 و تجربات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کے کچھ
 نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کتاب میں ایسی
 قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے کی طرح بالا و برتر
 نہیں لیکن اس میں کچھ ایسی قومی خصوصیات اور منضبط
 اور مربوط زندگی کے کچھ ایسے پہلو ہیں جن سے ہم اس
 زمانہ میں بے خبر رہ سکتے اور نہ بے خبر رہنا چاہیے۔
 اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہو
 لیکن اس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا
 سامان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی تعمیر و تشکیل
 کے خاکہ میں یورپ کی زندگی کی یہ چند تصویریں مفید
 ثابت ہونگی۔“

ڈاکٹر سیّد الطیف

یورپ کے تاثرات

(یعنی چھپری زندانِ وطن کے مشاہدات و تجربات کا مرقع)

تألیف

محمد بدرالدین خان شکیب بی۔ اے۔ ال۔ بی۔ ویل انگریز

مطبعہ

اعظم اسٹیم پریس جیڈا بونکن

جلد حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

۱۳۲۹ھ

قیمت

عمر

بار اول

۱۳۵۰

ملنے کے پتے :-

سید عبید القادر اینڈ سنز تاجران کتب چارمینار -
کلبہ ابراہیمیہ
عابد روڈ
کتب خانہ اردو
عابد روڈ
ڈیگر مشہور تاجران کتب حیدرآباد دکن -

ملک کے نوجوانوں کے نام

فہرست مضامین

پیش لفظ ڈاکٹر سید عبداللہ - پی - پی (لندن)

تعارف سید معین الدین قریشی ایم۔ اے۔

دیباچہ بدر شکیب

۱ بیان علامہ عبدالحق یوسف علی ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ ام، آئی۔ سی۔ یس

۱۱ رائے سری کشن بیرسٹر

۲۱ ڈاکٹر لطیف سعید ایم۔ بی۔ سی۔ یچ (اڈنبرا)

۲۳ سید حیدر رضا زیدی ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹر لا

۳۲ سید محمد حسین جعفری بی۔ اے (آکسن) ناظم تعلیمات سرکار لا

۳۹ محمد عبدالرحمن خان بی۔ اے۔ یف۔ آر۔ اے۔ یس (لندن) سابق ملک کیہ جانشین

۴۶ ڈاکٹر زینب حسین پروفیسر جامعہ جنوبی کینیڈا (امریکہ)

۵۵ سجاد مرزا ایم۔ اے (کنٹنٹ) پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج

۶۱ قادر حسین خاں ایم۔ اے۔ بیرسٹر لا۔ پرنسپل نظام کالج

۶۵ حسین علی مرزا بیرسٹر لا مکذ شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ

۷۷ ڈاکٹر سہجے سوری ایم۔ ڈی (برلن)

۸۲ یس۔ ایم۔ اودی بی۔ اے (کنٹنٹ) ناظم سررشتہ پاکستان کونسل کراچی

۹۰ ڈاکٹر ظیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ پی۔ یچ۔ ڈی (وائٹ ہیرنگ) مکذ شعبہ فلسفہ جامعہ لاہور

۱۰۱ صفرا اہالیون مرزا

بیان میر اکبر علی خاں بی۔ سہرال الہی (آئرنز) (لندن) بیرسٹر لا ۱۰۶

✓ محمد صلاح الدین ایم۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۱۱۰

✓ ڈاکٹر مقبول علی بی۔ اے، یل۔ آر۔ سی۔ پی۔ ایم۔ آر۔ سی۔ یس

۱۲۵ (لندن) سیول سرجن

ڈاکٹر میریاد علی خاں ایم۔ اے، پی۔ یچ۔ ڈی، بی۔ سی۔ یل

۱۳۱ (آکسن) بیرسٹر لا

ڈاکٹر یوسف حسین خان بی۔ لٹ۔ (پیرس) پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۱۳۴

✓ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔ اے، پی۔ یچ۔ ڈی (کتب) ۱۴۴

✓ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زوریم۔ اے، پی۔ یچ۔ ڈی

۱۵۳ (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ

جیب الرحمن ایم۔ اے، بی۔ یس۔ سی (لندن)

۱۶۱ ناظم معلومات عامہ سرکار کے

۱۶۴ مسز جمال الدین بی۔ اے

✓ ڈاکٹر حمید اللہ ایم۔ اے، پی۔ یچ۔ ڈی (بان) بی، لٹ

۱۶۱ (پیرس) پروفیسر جامعہ عثمانیہ

۱۰۸ محمد صدیق

پیش لفظ



یورپ باوجود رنگ و نسل کے امتیازات کے کئی حیثیتوں سے ایک ایسی اقلیم ہے جو ایک ناظر کے دل پر دیرپا ارتقائات اور نقوش بٹھاتی ہے۔ وہاں کے حیرت انگیز سائنس کے اکتشافات اور مادی ترقیوں نے اہل یورپ کی معاشی، اخلاقی اور سیاسی زندگی اور اس کے نصب العینوں میں ارتقاء زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ یورپ کی حیات اجتماعی مختلف پچیدہ اور عالمگیر اہمیت رکھنے والے مسائل کا منظر بن گئی ہے۔ ہندوستان کا جو بحنت و اتفاق سے یورپ کی ایک طاقتور سلطنت کے زیر اقتدار ہے ان جدید خیالات اور رجحانات سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔

یہ کتاب ان ارتقائات کا مجموعہ ہے جو ایسے فرزندان وطن کے دلوں پر منقوش ہوئے ہیں جنہیں یورپ میں کسی نہ کسی حیثیت سے رہنے پہنچے اور اپنے اپنے زاویہ نظر سے اُس کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ مشربدر شکیب نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اس میں ہر نقطہ نظر کے لوگ شامل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ماہرین تعلیم بھی ہیں، سیاست بھی ہیں، ادیب ہیں، سائنس داں ہیں، بیرسٹر ہیں، ڈاکٹر ہیں۔ غرض ہر قسم کے لوگ ہیں جس سے

کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بظاہر ان اقسام کا ہر شخص کے طبعی رجحان، جلی صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر آپس میں مختلف ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ مسرت کا مقام ہے کہ مرتب نے اپنے ذوق نظر سے ایسے اصحاب کا انتخاب کیا جو بحیثیت مجموعی یورپ کی زندگی اور حالات کا ایک مربوط اور متناسب نقشہ پیش کر سکتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ صحیح معنوں میں ایک مفید اور دلکش موقع ہے۔

مسٹر بدر شکیب جامعہ عثمانیہ کے ان قابل فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے ذوق اور صلاحیت کی تربیت سے ملک کے ان مسائل پر جوابی فکر کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں، چچی تلی نظر پیدا کر لی ہے۔ انہوں نے رائے کے اظہار میں ہر صاحب بیان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ بڑی دانائی اور احتیاط کے ساتھ فکر اور رائے کے دائرہ کو چند سائنٹفک حدود میں متعین کر دیا جو ان اقسام کے افادی قدر و قیمت کی ضامن ہیں۔ جو سوالات انہوں نے ہر صاحب بیان کے سامنے پیش کئے اور جن موضوعات پر تبادلہ خیال اور بحث و تہیص کی ان سے بجائے خود زندگی کا ایک زاویہ نظر ظاہر ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی منزل مقصود کیا ہے اور ہندوستان کیا چاہتا ہے۔ دراصل ایک مقصد کی تلاش ہے جس کے نشانہ ناظرین اس کتاب کے ہر صفحہ پر پائیں گے۔

یہ کتاب صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں زندگی کے کچھ نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ ہیں اس

کتاب میں ایسی قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے کی طرح بالا و برتر نہیں لیکن اس میں کچھ ایسی قومی خصوصیات اور منضبط اور مربوط زندگی کے کچھ ایسے پہلو ہیں جن سے ہم اس زمانہ میں بے خبر رہ سکتے اور نہ بے خبر رہنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ لیکن اس میں دلچسپی سے زیادہ بعیرت و عبرت کا سامان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی تعمیر و تشکیل کے خاکہ میں یورپ کی زندگی کی یہ چند تصویریں مفید ثابت ہوں گی۔

اسٹیو عبد الطیف پی۔ بیچ۔ ڈی (لندن)

جید آباد دکن

تعارف

(*)

میں نے یورپ کی کبھی سیر نہیں کی۔ اُس کے جلوے دُور ہی سے دیکھے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے نقوشِ یورپ کے اس دل نشین مجموعہ پر قلم اٹھانے کا بہت کم حق حاصل ہے۔ لیکن میں اپنے دوست بدر شکیب کی فرمائش اور ایک نامعلوم سی ترغیب کو کسی طرح ٹال نہیں سکتا۔

ہمارے ملک میں یورپ کے تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں جن کی ایک بڑی تعداد نظم و نسق کے سانچوں میں ڈھلی جا رہی ہے۔ اس کارخانے سے یقیناً کبھی کبھی اچھی صنعتیں بھی نکلتی رہتی ہیں لیکن عام طور پر آشنایانِ فرنگ کی خوش نما ٹولیوں میں ایسے لوگ خال خال ہی نظر آئینگے جنہوں نے اپنے آپ کو پبلک زندگی اور اُس کے قریبی مسائل سے وابستہ کیا ہو یا ملک کے وسائلِ حیات میں اضافہ کرنے کے لئے کوئی نئے نئے ہمت آزمایا ان اپنے لئے پیدا کئے ہوں۔ اس کی وجہ بہ ظاہر ہی معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی مستعار امانتیں ترقی کے اُن گنت امکانات اور نئی تہذیب کی بے پناہ قوتیں دیر تک شانِ مجاز میں ان کے جلو میں رہتی ہیں کبھی وہ سوسائٹی سے اس قدر اُوچے ہو جاتے ہیں کہ اُن کی نظر عام نظروں سے مل نہیں سکتی اور کبھی وہ اپنے اندر ایک نئی نوع کے وجود کا احساس اس قدر قوی پاتے ہیں کہ جب وہ بولتے ہیں تو اُنکی

بُلی کسی کے سمجھ میں نہیں آتی پھر حجابات کچھ اٹھنے لگتے ہیں لیکن اُس وقت جبکہ زمانہ عمل سے زیادہ ردِ عمل اور خیال سے زیادہ ردِ خیال کا ہوتا ہے۔ اس دور میں خود ہی کو کچھ سوچہ جائے تو سوچہ جائے لیکن اوروں کو کوئی کیا سمجھا سکے۔ یورپ کی تماشاکاہ سے بہت سے تماشائی کچھ اسی آن سے لوٹے اور اسی ذہب کی زندگی بسر کی لیکن انہیں میں بعض ایسے ارباب نظر بھی ہیں جنہوں نے کچھ دیکھا اور جو کچھ وہاں دیکھا ہمیں بھی دکھانے کی کوشش کی۔ کچھ حاصل کیا اور جو بھی اس خاکِ رواں سے انہیں ملا ہمیں بھی دینے کی کوشش کی۔ اس مجموعے میں کچھ ایسے ہی دیدہ وروں کی جھلکیاں نظر آتی ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ابھی نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

یورپ ایک عجیب سرزمین ہے جہاں تہذیب کے نت نئے نظام بنتے اور گزرتے ہیں اور معاشرت کے گوناگوں تجربات آئے دن آزمائے جاتے ہیں۔ زندگی کی سطحی اور گہری چیزیں، کثیف و لطیف رجحانات، بیک وقت آپس میں دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ ایک پر رطف مشغلہ چپکے چپکے ایک سنجیدہ مسئلہ بن جاتا ہے پھر یہی عالمانہ سنجیدگی کسی کے ہاتھوں ایک دلچسپ مشغلہ میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ زندگی ایک متظم کھیل ہے جس کو سوطح سے کھیلا جاتا ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہر ایسے یا اسی قسم کے عمل میں ایک ”طریقہ“ کا رفرار ہوتا ہے جس کا مقصد کوئی نہ کوئی مادی نتیجہ خیزی ہے۔ یہاں فکر و دانش ہے، حکمت و تدبیر ہے، علم و فن ہے، عمل و تنظیم ہے، سلیقہ ہے، حُسن ہے اور اس کی آرائش ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان

مٹا ہر حیات میں سب کو ہم آہنگ کرنے والی رُوح کس طرح کام کر رہی ہے۔ یورپ نے قدرت کی بہت سی اُن بوجھ قوتوں کو اپنا رفیق بنالیا لیکن کیا وہ زندگی کے کسی دُور رس مستقبل کو پہچان سکا۔ اس کی بے شمار ترقیوں میں ہماری مجبوریوں کا بھی کچھ حال کھل سکتا ہے ؟

یہ ایک سوال ہے جو مختلف انداز سے یورپ کے تربیت یافتہ صاحبوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی سوال کو بد شکیب نے اپنے مجتہس دماغ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شکیب کی زندگی سوچ بچار اخلاک اور گہرے احساس سے لپٹی ہوئی ایک عمل کی زندگی ہے۔ وہ ہمیشہ کچھ کرنا اور کام کا راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل اُن کی اسی کوشش کا ایک نتیجہ ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ لوگ اس کتاب کو ذرا غور سے پڑھیں !

جید آباد دکن

۲۲ آبان ۱۳۴۸

دیباچہ

ہندوستان پر یورپ کے تمدنی اور تہذیبی اثرات یوں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ہی سے شروع ہو گئے تھے لیکن ان میں شدت ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد پیدا ہوئی اور غدر کے بعد سے اسی سال کے قلیل عرصہ میں مغربی تہذیب ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سلطیت کر گئی۔ ہماری معاشرت ہمارے سیاسی اور سماجی تصورات، ہمارے قانونی اور معاشی آئین، ہماری زبان، ہمارا ادب، غرض ہماری ہر چیز آج مغربی اثرات کی رہن منت ہے اور مغرب نے ان پر وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ ان کے محو ہونے کیلئے بڑا عرصہ لگے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تہذیب و تمدن کسی طرح مغربی تہذیب و تمدن سے کمتر ہے بلکہ بظاہر اس کے یہ اسباب معلوم ہوتے ہیں کہ جب دو قومیں یا تمدن آپس میں متصادم ہوتے ہیں تو غالب قوم کا تمدن مغلوب قوم کے تمدن پر چھا جاتا ہے اور اگر بدقسمتی سے احساسِ ہستی بھی رونما ہو جائے تو یہ اثرات زیادہ گہرے اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہر زمانہ میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن تعجب اس امر کا ہے کہ مغرب کے اُن سارے اثرات کو قبول

کرنے کے باوجود ہم میں ابھی وہ خصوصیات پیدا نہیں ہوئیں جو مغربی اقوام کے لئے سرمایہ ناز ہیں اور جو ان کی ترقی کا اصلی سبب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم نے ان اثرات کا تجزیہ کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اور اگر کی بھی ہے تو بہت کم۔

اس وقت حیدرآباد میں یورپ سے واپس شدہ حضرات کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے کہ شاید ہی ہندوستان کے کسی شہر میں ہو اور ہر سال اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کو ان لوگوں سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ ایک طرف یورپ جانا آجکل بڑی حد تک محض اپنے ذاتی فائدہ کی غرض سے ہوتا ہے تو دوسری طرف ملک کا ماحول اور فضاء ایسی ہے کہ کام کرنے والوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ان کی قابلیتیں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ ان پر جو قومی دتہ صرف ہوتی ہے وہ رائیگاں جاتی ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ اس کے کون ذمہ دار ہیں اور اس کی کیسے اصلاح ہو سکتی ہے۔ ایسے سوالات ہیں جن کا یہاں جواب دینا میرے موضوع سے خارج ہے۔ میں نے اس کتاب میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ چارے مقابلہ میں یورپ اتنا ترقی یافتہ کیوں ہے۔ اہل یورپ میں آخر وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ ہم پر فوقیت رکھتے ہیں اور جن کا ہم میں پیدا ہونا ضروری ہے تاکہ ہم سب زندہ اقوام کی صف میں آسکیں۔ ہم میں کونسی کمزوریاں ہیں

اور انہیں کس طرح دُور کیا جاسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ سوالات ہیں جن کے جوابات میں ہماری قومی اور ملی ہستی کا راز پوشیدہ ہے۔

قوموں کا عروج و زوال قانون قدرت کا تابع ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک دُنیا میں مختلف قوموں اور تمدنوں کو عروج حاصل رہا۔ اُن کے نشیب و فراز کے اسباب و علل پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ اقوام اور زندہ تمدنوں میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زندہ رہتی ہیں اور جب اُن میں انحطاط پیدا ہوتا ہے تو قومی زندگی میں بھی انحطاط کی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ آج ہمارا بھی یہی حال ہے۔ ہمارا ماضی تو شاندار ہے لیکن مستقبل تاریک کیوں ہے۔ اس کی وجہ سبب اس کے کچھ نہیں کہ ہمارے اسلاف بعض ایسی خوبیوں کے حامل تھے جو زندہ اقوام کے لئے ضروری ہیں ہم میں وہ اوصاف نہیں رہے اور ہم مُردہ ہیں۔ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے اور دُنیا میں پھر سر بلند ہونا ہے تو ہم میں اُن خوبیوں کا پیدا ہونا ضروری ہے جن سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور جن کے بغیر فنا ہو جاتی ہیں۔ اہل یورپ کی ترقی اور انکی خصوصیات ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں لیکن اُن کے حالات کی تفصیل اس لئے بتلانی ضروری ہے کہ آج کل اُن ہی کی مثال ہمارے پیشِ نظر ہے اور یہی ہمارے لئے نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بھولا ہوا سبق یاد دلایا جا رہا ہے ممکن ہے اس سے ہم میں ازمنہ نو زندگی کی کوئی لہر پیدا ہو جائے۔

یورپ کے متعلق اُردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کی تعداد انگلیوں پر

جا سکتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا کہ وہ لوگ جو برسوں یورپ میں رہے
 اور جنہیں صحیح معنوں میں یورپ کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے انہوں نے
 تک اپنے خیالات و مشاہدات کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔
 وہیں یورپ سے متعلق جو تھوڑا بہت ادب ہے وہ بیشتر سیر و سیاحت
 فیصل ہے۔ ان سفر ناموں میں بہت کم مصنفین نے یورپ اور اہل یورپ
 خصوصیات کا تجزیہ کرنیکی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں
 یورپ کی معاشرت اور تمدن کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن یہ چیزیں
 محشادہ اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ایسی کتابیں محض اپنے لکھنے والوں
 خیالات و احساسات اور دلچسپیوں کی آئینہ دار ہیں۔ زیر نظر کتاب میں
 ہر زاویہ سے نظر کے لوگوں کے خیالات کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے
 والے خود اپنے طور پر نتائج اخذ کر لیں۔

ابتداءً جب میں نے اس کتاب کے لکھنے کا خیال بعض اجاب پر ظاہر
 کسی نے تائید کی اور کسی نے مخالفت۔ حیدر آباد کے ایک بڑے امیر نے
 خیال کا مذاق اڑایا اور اپنا بیان دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میں ہر اس
 سہواً جب میں نے دو ایک بیانات قلمبند کر لئے تو خود مجھے دلچسپی ہونے
 اور اعتراضات کا خیال نہ کر کے میں اس کام میں مجو ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ چھ ماہ
 یہ کام ختم کر لوں گا لیکن اس میں دو سال لگ گئے اور اس کے بعد میں نے
 اس کیا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی ادبی کوشش کس قدر کٹھن اور صبر آزما
 ہے۔ میری مشکلات کا اندازہ میرے بعض دوستوں کو جن کے

بیانات اس کتاب کی زینت ہیں۔ جن اصحاب کے بیانات میں نے قلمبند کئے ہیں ان کا انتخاب میں نے اپنے طور پر کیا ہے۔ میں نے صرف ایسے اصحاب کے بیانات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو واقعا اپنے دل میں قومی درد رکھتے ہیں جنہوں نے یورپ کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور جو ذہن و کردار کے لحاظ سے ملک کی قابل احترام ہستیاں ہیں۔ یہ حیدر آباد کے بہترین دماغ ہیں اور یہ کسی بھی ملک یا صوبہ میں رہتے تو اس کے لئے مایہ ناز ثابت ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض گمنامی میں ہیں لیکن اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انہوں نے گمنامی میں رہنا پسند کیا اور نہ کہ زمانہ میں شہرت پر دوپگنڈے کا دوسرا نام ہے۔

اس کتاب میں جملہ پچیس اصحاب کے بیانات ہیں جن میں سے دو بیراؤ حیدر آباد کے ہیں۔ علامہ عبداللہ یوسف علی اور سید حسین۔ میں نے کوشش کی تھی کہ باہر کے مشہور لوگوں اور رہنمایان قوم کے کچھ اور بیانات حاصل کر دوں اور اس سلسلہ میں میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام رہنمایان قوم کے نام خطوط روانہ کئے تھے لیکن گاندھی جی، ڈاکٹر ٹیگور اور سر شاہ سلیمان کے سوا جنہوں نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر معذرت چاہی کسی نے خط کا جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی جسن جو بلی کی تقریب میں اور ڈاکٹر سید حسین تقریری سفر کے سلسلہ میں بلدہ تشریف لائے تھے۔ علامہ موصوف نے اپنے وعدہ کے بموجب لاہور سے اپنا بیان روانہ فرمایا اور ڈاکٹر صاحب نے اس امر کی اجازت دی کہ ان کی تقاریر سے میر

ان کا بیان مرتب کر لوں۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ خود حیدر آباد کے بعض لوگ رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو میری اپنی مصروفیتیں ہیں اور کچھ ”پیر دی“ سے گھبراجانا۔ اگر حالات اجازت دیں اور وقت ملے تو میں آئندہ اس کی تلافی کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو بیانات اس کتاب میں شائع ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر محض گفتگو (inter views) کی تفصیل ہیں بعض بیانات تحریری تھے جنہیں میں نے اپنے طور پر لکھ لیا۔ بعض انگریزی کے ترجمے ہیں۔ مثلاً علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ڈاکٹر یوسف سعید۔ ڈاکٹر جے سوریا اور ڈاکٹر رضی الدین کے بیانات۔ جو بیانات زبانی حاصل کئے گئے تھے ان میں سے تقریباً تمام میں نے ”صاحب بیان“ کو دکھلایئے ہیں مبادا افراط و تفریط کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہو۔ میں نے خاص طور پر کوشش کی ہے کہ بیانات میں میری جانب سے کوئی اضافہ یا ترمیم نہ ہو۔ لہذا بیانات میں جو بھی خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ صاحب بیان کے اپنے خیالات ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ میری حیثیت محض ایک راوی کی ہے۔

بیانات کی ترتیب میں نے سندواری رکھی ہے یعنی جو صاحب یورپ پہلے گئے ہیں ان کو پہلے جگہ دی گئی ہے۔ یہ طریقہ مجھے اس لئے پسند آیا کہ اس میں یورپ کے حالات کا ارتقائی اور تدریجی طور پر اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

آخر میں ان تمام اصحاب کا ممنون ہوں جن کے بیانات اس کتاب کی بنیاد ہیں کہ انہوں نے میری استدعا پر ملک و قوم کو اپنے خیالات اور مشاہدات

سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اپنے اجاب میں میں خاص طور پر مولوی سید محمد حسام
 ایم۔ اے اور مولوی سید محمد اکبر صاحب وفاقانی بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی کا شکر گزار ہوں
 کہ ان کے مفید مشوروں اور رہنمائی سے مجھے بڑی مدد ملی۔
 یکم آبان ۱۳۴۸

بیت الامیر
 لے پی جدید حیدر آباد دکن

علامہ عبداللہ یوسف علی

علامہ عبداللہ یوسف علی م۔ اے۔ ال۔ ال۔ یم (کنٹ) آئی۔ سی۔ یس۔ سی۔ بی۔ اسی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی شہرت بین الاقوامی ہے۔ انڈین سیول سروس سے آپ کا تعلق ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک رہا۔ یہاں سے وظیفہ لینے کے بعد آپ ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۹ء اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں ہندوستانی زبانوں، مذاہب و تہذیب کے لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت سرکار عالی نے آپ کی خدمات بحیثیت صدر المہام مال حاصل کیں۔ اس کے بعد صدر المہامی صنعت و حرفت پر آپ فائز ہوئے۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہو گئے۔ آجکل آپ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ آل انڈیا مسلم کونسل کافرٹن کی سٹا میں اور خلافت کافرٹن کی سٹا میں آپ نے صدارت بھی فرمائی ہے۔ آپ انگریزی کے ایک ستم ادیب اور کئی بلند پایہ کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ جس کے کچھ حصے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں کلام پاک کا ایک بہترین دستند ترجمہ ہے۔

اختلافات | یورپ کی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کو ایک مختصر مضمون میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ یورپ ایک بڑا رقبہ ہے۔ اور اس میں متعدد ممالک شامل ہیں جن میں سے ہر ایک کی زبان جداگانہ ہے اور قومی زندگی مختلف۔ ایک ملک کے حالات سے دوسرے ملک کے حالات میں اتنا زبردست اختلاف پایا جاتا ہے کہ کل یورپ کی ایک ہی تصویر کھینچنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میرے لئے شاید یہی بہتر ہوگا کہ میں برطانوی غلطی کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کر دوں۔ یہاں بھی اختلافات ہیں لیکن اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ ان مجموعہ خیالات میں پائے جاتے ہیں جنہیں سوویت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان مجموعہ خیالات میں جو جرمنی میں نازی حکومت کے زیر سایہ پرورش پائے ہیں۔

ہندوستانی و برطانوی زندگی کا مقابلہ | ہندوستانی زندگی کے مقابلہ میں ملاوٹ کی زندگی کی پہلی چیز جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ بحیثیت مجموعی ایک منضبط قومی زندگی کا وجود ہے۔ 'انگلستان'، 'اسکاچستان'، ویلز اور شمالی آئرستان ایک دوسرے سے مختلف رقبے ہیں۔ ویلز کے اندرونی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ولش ہے نہ کہ انگریزی اور یہ معیاری انگریزی زبان سے جس سے کہ ہم واقف ہیں بہت ہی مختلف ہے۔ 'اسیٹھ' اسکاچستان کے پہاڑی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ گیلک ہے اور یہ بھی انگریزی سے مختلف ہے۔ 'اسکاچستان' کے نشیبی علاقوں میں جو بولی بولی جاتی ہے وہ تلفظ اور بعض الفاظ و محاورات کی حد تک انگریزی سے

مختلف ہے۔ اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل برطانیہ میں قومیت کی جو روح ساری ہے وہ ان تمام علاقوں میں بشمول شمالی آئرستان ایک ہی ہے۔ قومی زندگی اور سیرت کا یہ میل ہندوستانی زندگی کے مقابلہ میں (جو متعدد متباہن اور بعض صورتوں میں متنازع فیہ طریقہ خیال طرز و روش اور کردار میں منقسم ہے) بہت نمایاں ہے۔ ہندوستان میں بہت سی قومیں اور ذاتیں ہیں اور یہ عموماً ایک ہی صوبہ یا ضلع میں یا ایک ہی قصبہ یا موضع میں ایک ہی جگہ آباد ہیں۔ ان میں سے ایک کی زبان دوسرے کی زبان سے مختلف ہے۔ ان کی روایات اور تراویہ اے نگاہ مختلف ہیں۔ انگلستان میں حالانکہ مختلف فرقوں یا کلیساؤں کی نسبت سے مختلف مذاہب کا وجود ہے لیکن اس کے باوجود کردار و روش کا عام طور پر ایک ہی معیار ہے جس سے لوگ کافی حد تک قومی زندگی میں وحدت کا رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ اتحاد گونا گویا ہری ہی لیکن پھر بھی اس ظاہری وحدت سے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے اور دوسرے لوگوں یا اقوام سے مینز ہونے میں مدد ملتی ہے۔

سرمایہ اور محنت یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرمایہ اور محنت میں معاشی خلیج دن بدن وسیع ہوتی جا رہی ہے جو دولت مند اشخاص اور عامۃ الناس میں حقیقی فرق کے مترادف ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اس فریق کے اثرات کو مبالغہ کے ساتھ نہیں بیان کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں سرمایہ منظم ہے اور محنت بھی منظم ہے اور حکومت کے توسط سے ان دونوں میں ربط و اتصال اور آپس کے تصفیوں کے لئے راستے مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کی معاشی زندگی میں

دونوں جاعتوں کو ایک دوسرے سے اتصال قائم کرنے کے متعدد مواقع حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کی معاملہ فہمی کی وجہ سے ان دونوں میں کوئی ایسا تفرقہ نہ پڑ سکا جس سے قومی زندگی میں انتشار پیدا ہو جاتا۔ ساتھ ہی قوم کے ایک طبقہ کے معاشی مطالبات کو دوسرے سے تسلیم کرنے میں تجارتی انجمنوں، قومی کونسلوں اور اس قسم کے دیگر ادارات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ صورت حال اس خلیج سے بہت مختلف ہے جو ہندوستان میں شمال کے طور پر دہلی جماعت کے مسلمانوں کو دوسرے فرقوں کے مسلمانوں سے یا ہندوؤں یا جینیوں سے علیحدہ کرتی ہے یا جو خلیج ہمارے دو لٹمنڈ لوگوں اور کاشتکاروں کے درمیان حائل ہے۔

یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کا جو طریقہ رائج ہے

ذات پات

وہ ہندوستان کے لئے مخصوص نہیں ہے اور یہ کہ انگلستان میں اونچے طبقات اور کام کرنے والے طبقات میں حقیقی معنوں میں ذات پات کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ بیان اتنا واضح ہے جتنا کہ اس قسم کے ایک عام اور وسیع بیان کو ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ ایک زمانہ میں جاگیرداروں اور عام لوگوں میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کا خیال ضرور موجود تھا۔ لیکن اس خیال کا کبھی صریح طور پر اظہار نہیں ہوا اور ان دونوں میں ہمیشہ میل جول ہوتا رہا۔ اکثر غریب لوگ مالدار بن گئے اور انہوں نے جاگیریں خریدیں گو ابتدا میں جاگیرداروں کے خاندانوں کے نزدیک ان کی خاندانی وجاہت مشتبہ ہی رہی لیکن ایک دو پشت گزرنے کے بعد حالات بدل گئے اور دونوں میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہا۔ اسی طرح انگلستان کے موروثی امرا

بھی اکثر بیشتر معمولی خاندانوں سے منتخب کئے گئے ہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ دارالامراء کے اکثر اراکین کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جنہوں نے حال حال میں یا گذشتہ دو تین صدیوں میں ترقی کی ہے۔

جامعاتی طبقہ | برطانیہ عظمیٰ میں جامعاتی تعلیم والوں کا کوئی گروہ یا طبقہ نہیں ہے لیکن انیسویں صدی کے وسط یا شاید اس سے کچھ بعد تک

پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک سماجی طبقہ تھا جس کو ملک میں تھوڑی بہت اہمیت حاصل تھی۔ برطانوی تعلیم میں اس طبقہ کا قبضہ جاری رہا۔ لیکن حال حال میں قدیم ترین پبلک اسکولوں کو بھی جدید تعلیم کی اسکیم میں شریک کیا گیا ہے اور طبقہ واری امتیازات بتدریج زائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اکثر جدید پبلک اسکول حالیہ پیداوار ہیں اور ان کی حیثیت 'اٹین' ہیا رویا و پنچٹر جیسے اسکولوں سے بالکل مختلف ہے۔ ایسٹچرکس فورڈ اور کیمبرج کی دونوں قدیم جامعات جو اونچے طبقات کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں اب برطانوی تعلیم کی عام اسکیم کے تحت ہیں۔ ان جامعات میں اب عوام کے اکثر لڑکے تعلیمی وظائف اور امداد کے ذریعہ شریک کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو دیہات کے معمولی بورڈ اسکولوں سے بھی آتے ہیں۔ اسکورڈ میں تو ایک ایسا کالج ہے جسکے کالج جو خاص طور پر مرز دور پر مشیہ طبقات کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی جدید جامعات ہیں جو جدید خیالات کی حامی ہیں اور جہاں ادنیٰ متوسط اور مرز دور پر مشیہ طبقات کے مرد اور عورتوں کی بڑی تعداد شریک ہے۔

سیاسی جماعتیں | یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی جماعتیں خاص گروہوں میں منقسم ہیں

زندگی میں رخصت ڈالتے ہیں۔ ایسا شاید ایک صدی قبل ممکن تھا لیکن آجکل نہیں ہے۔
وری اور وگ جماعتیں ناپید ہو گئی ہیں البتہ کبھی کبھار اُن کے نام سُنے جاتے
۔ جدید جماعتیں خود کشمکش کی حالت میں ہیں۔ ہر عام انتخاب کے وقت ہمیشہ
، دو جماعتوں میں الٹ پھیر ہوتی ہے اور نئی جماعتیں معرض وجود میں آتی
ہیں۔ ایسی کوئی جماعت نہیں جسے قائم کہا جاسکے یا ایسی جو ایک ہی تعداد
۔ اشخاص کے لئے مخصوص ہو۔ ایواناتِ قانونی میں کتنی بھی جماعتیں ہوں
نہ یہ امر خوش آئند ہے کہ خارجی پالیسی یا ایسے معاملات جن میں ملکی مفاد و حیثیت
کی کسی دوسرے ملک کے مفاد کے متاثر ہو تو عام طور پر آپس میں سمجھوتہ
اجاتا ہے جس کے بعد تمام جماعتیں حکومت کی تائید کرتی ہیں جو فی الوقت
لی ٹائمنہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ میں بھی خاص روایات ہیں جو
مت وقت اور حزب الاختلاف کے تعلقات کو معین کرتے ہیں۔ ہر حزب
ملاف اس امر سے واقف ہے کہ کسی دن اسے بھی حکومتی ذمہ داریوں اور
وں سے دوچار ہونا پڑیگا لہذا داخلی سیاسیات کے اختلافی امور میں کتنی بھی
ت مخالفت کیوں نہ ہو لیکن وہاں آپس میں ملکہ کام کرنے کا جذبہ ضرور پایا
ہے۔

مک زندگی | بحیثیت مجموعی انگلستان کی پبلک زندگی کی پاکیزگی سے
میں بہت متاثر ہوں کبھی کبھار رشوت ستانی کے قصبے بھی
فہ جاتے ہیں جو عموماً قصبہ کی کونسلوں یا معمولی انتظامی ادارات میں پیدا
تے ہیں۔ لیکن انگلستان کی سٹائش میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں پبلک زندگی

عام رجمان اکثر مالک کے نسبت جن سے میں واقف ہوں پاکیزگی کی طرف بہت زیادہ مائل ہے۔ شہرخص جانتا ہے کہ مسٹر بالڈون ایک بے دغ کردار کے مالک مشہور ہیں جو نہ صرف ذاتی و فاعلی اغراض و مفاد سے بالاتر ہیں بلکہ جماعتی اغراض و مفاد سے بھی یا ان شاطرانہ اغراض و مفاد سے جو ادنیٰ ذہنیت کے سیاست دانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے جیسے وہاں بیسیوں آدمی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مستقل و اعلیٰ ترین عہدہ دار نے ایک کمپنی سے کچھ ایسی سفاهت کر لی تھی کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کمپنی میں اسے بڑی خدمت مل جائے۔ لیکن جب مسٹر بالڈون کو اس کا علم ہوا تو بڑی حکمت اور تدبیر سے انہوں نے اس ملازم سرکار کے کردار کی مذمت کی اور اس عہدہ دار کو اپنی ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس معاملہ میں رائے عامہ نے مسٹر بالڈون کی کامل تائید کی۔ اسی طرح جنگ عظیم کے وقت مسٹر آسٹن چمبرلین انجمنی نے اپنی وزارت ہند کے زمانہ میں جنگ کی بعض بدانتظامیوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی حالانکہ ذاتی طور پر وہ کیسے طرح ذمہ دار نہیں قرار دیئے جاسکتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے تو بحیثیت افسر اعلیٰ اس کی ذمہ داری اور نتائج اُنہیں قبول کرنے ہونگے۔ لہذا وہ مستعفی ہو گئے۔ چونکہ اس معاملہ میں وہ بالکل بے قصور تھے لہذا اس استعفاء سے ان کی آئندہ زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ اس سے پہلے زندگی کے اس اصول کی تائید ہوئی کہ ہر افسر اعلیٰ اُن نتائج کا ذمہ دار رہیگا جو اس کے ذمہ انتظام میں کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انگلستان میں ملازمین سرکار کا معیار کردار کتنا

بلند ہے۔ مسٹر گلاڈسٹن کے زمانہ کا بھی ایک واقعہ ہے کہ کسی جماعت کے ایک لیڈر سے جو مسٹر گلاڈسٹن کی لبرل جماعت سے اشتراک عمل کئے ہوئی تھی کوئی اخلاقی جرم سرزد ہونے پر مسٹر گلاڈسٹن نے اس لیڈر کے مستعفی ہونے پر اصرار کیا تھا۔ شاہ ایڈورڈ کی دستبرداری کے حالیہ واقعہ کے وقت ایک ایسے معاملہ میں جس میں برطانوی اخلاقی معیارات کا امتحان تھا مسٹر بالڈون نے جس تدبیر بر د باری اور ثبات قدمی کا ثبوت دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی قوم اپنی اعلیٰ ترین روایات کو برقرار رکھنے میں کس سطح بلا فرق مراتب متحد ہو سکتی ہے۔

یہ سب اس لئے ممکن ہے کہ وہاں ایک مضبوط اور بیدار رائے عامہ

رائے عامہ موجود ہے۔ اس کا یقیناً امکان ہے کہ ایسی چیزوں میں رائے عامہ سے غلطی ہو جائے جن میں کسی شخص کا ذاتی کردار عامۃ الناس کے خیالات کے مغائر ہو۔ لیکن میرے خیال میں برطانوی راعی کی اصابت نے اکثر نازک موقعوں پر برطانیہ عظمیٰ کی دستگیری کی اور اسے خطر سے بچایا ہے۔

رائے عامہ کی اس طاقت کی وجہ سے برطانوی اخبارات بھی سیدھے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کبھی ذوق سلیم کو دھکا نہیں پہنچاتے لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تمام اچھے اخبارات تنقید عامہ کے اعلیٰ ترین معیارات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو کبھی اتنا نہیں گرا لیتے کہ ذاتیات کے رکیک حربوں کے اختیار کرنے یا ایسے طریقوں پر عمل پیرا ہونے کا الزام ان پر عائد کیا جاسکے جو مفاد عامہ کے لئے مضرت رساں ہوں۔

گھریلو زندگی | مشرق میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی گھریلو زندگی کے مقابلہ میں برطانوی زندگی کچھ اچھی نہیں اگر اُس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کی طرح خاندان آپس میں ایک دوسرے سے بل کر نہیں رہتے ہیں تو یہ صحیح ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خاندان کی برطانوی تعریف جو شوہر، بیوی اور کس بچوں پر مشتمل ہے، اچھی تعریف ہے۔ اس سے ہر فرد کو اپنی انفرادیت کے نشوونما دینے کا موقع ملتا ہے۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کے بعد اپنا جینا الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے والدین یا قریبی رشتہ داروں سے بالکل بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اُس کے یہ معنی ہیں کہ انہیں اپنے انفرادی ذوق و دلچسپی کو اپنے طور پر ترقی دینے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اکثر خاندانوں کے جوان سال لڑکے اور لڑکیاں آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، کینیڈا اور برطانوی شہنشاہیت کے دیگر علاقوں میں بس گئے ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے ممکن ہے یہ لوگ بے تعلق سے ہو جائیں لیکن بعد میں خود ان کی آزاد زندگی انہیں اپنے خاندان اور عزیزوں کی محبت بھری یاد تازہ رکھنے اور نسلاً بعد نسل اس تعلق کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کبھی پیدا نہ ہوتی اگر تمام لوگ ایک ہی جگہ گتھے رہتے اور ہر بزرگ خاندان کی تبدیلی کے وقت خاندانی معاملات میں جھگڑے اور فساد کی صورتیں رونما ہوتی رہتیں۔ انگلستان اور ہندوستان کے سنی معیار بھی ایک دوسرے سے مختلف

ہیں۔ لیکن میں اپنے تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انگلستان کے معیار اخلاق کو ہندوستان کے مقابلہ میں کسی طرح گرا ہوا نہیں پایا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔

رائے سری کشن

رائے سری کشن پیر سراجید رآباد کے ایک مسلمہ سیاسی لیڈر، ملک و مالک کے
 پیچھے ہی خواہ اور ہمدرد اور اپنی بے کوش زندگی اور خلوص کی وجہ سے ملک میں بے حد
 مشہور و ہر دلعزیز ہیں۔ ہر بچوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کے لئے آپ ایک
 زمانہ سے کوشاں ہیں اور اس خصوص میں آپ کی خدمات ملک میں انتہائی قدر
 کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کا شمار مجدد رآباد کے چوٹی کے پیرسٹروں
 میں ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۷ء۔ سن ۱۹۱۷ء میں بھی سیاحت
 کی غرض سے آپ یورپ تشریف لے گئے تھے۔

یورپ کی مادی ترقی | میرے اس سوال پر کہ اہل یورپ کی زندگی میں کونسی
 چیزیں جاذب نظر اور ان کی ترقی کا باعث ہیں
 رائے سری کشن پیرسٹرنے فرمایا کہ یورپ کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی

ماذمی ترقی ہے جس کا انحصار اہل یورپ کی محنت اور حوصلہ مندی پر ہے محنت میں وہ تمام خصوصیات داخل ہیں جن پر لفظ کاہلی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ عمل دراصل انہی زندگی کا اصل اصول ہے۔ حوصلہ مندی سے مراد کسی کام کو جوش اور یقین کے ساتھ کرنا ہے خواہ اس میں دوسرے کتنی ہی تکتہ چینی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں قوموں کی ترقی ان ہی دو چیزوں کی بدولت ہے اور ان کے نہونے سے قومیں ترقی سے محروم بھی ہو جاتی ہیں۔

قابل تقلید خصوصیات | جب میں نے یہ دریافت کیا کہ ہمارے لئے یورپ کی کونسی چیزیں قابل تقلید ہیں آپ نے فرمایا کہ ہمیں کسی قسم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن میں ترقی کے سارے امکانات موجود ہیں۔ مشرقی اقوام کی ترقی دیگر اقوام کے لئے ہمیشہ سرمایہ بصیرت رہی ہے۔ کسی قوم یا تمدن کی تقلید کرنے میں بڑی تباہیتیں ہیں۔ ایک معمولی مثال سے اس کی یوں توضیح ہو سکتی ہے۔ ہندو گھرانوں میں چو کھوں میں کھانے کا رواج ہے۔ روزانہ کھانے کے مقام کی صفائی ہوتی ہے، ہر شخص صبح اٹھ کر ناہ ہے اور ایک خاص طریقہ پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کو چھوڑ کر میز کو کسی پرکانے چھری سے کھانے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو پڑانے رسوم اور دستور کی اہمیت اور عظمت دلوں میں باقی نہیں رہ سکتی اور ان کا چھوڑنا ضروری ہے۔ اس کھانے ہی کی مثال کو اور واضح کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم طریقہ کتنا سہل سستا اور آرام دہ تھا۔ مغربی طرز کے کھانوں کا اہتمام ہی جد اگانہ ہوتا ہے۔

میز کرسی ہے، کانٹا چھری ہے، سامان خورد نوش ہے، پکوان ہے، بلکہ ہے،
کرہ ہے، کھانے کا طرز ہے، غرض بیسیوں نئی چیزیں ہیں۔

تیس چالیس سال قبل حیدر آباد میں صرف دو چار ہی لوگ مغربی تہذیب
کے دلدادہ تھے۔ اُس زمانہ کا ایک مغربی طرز کا ڈنر خصوصیت سے قابل ذکر
ہے جس میں حیدر آباد کے تقریباً تمام سربراہ اور وہ لوگ شریک تھے جن میں سے
اکثر کانٹے چھری کے استعمال ہی سے ناواقف تھے۔ میز پر ہر شخص اپنے برابر
والے کی نقالی کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک صاحب گلیہرٹ میں کسی چیز کو
کانٹے سے کھانے کے بجائے چھری سے کھا گئے اور ان کے ہونٹوں پر
چھری کا چرکا لگ گیا اور خون نکلنے لگا۔ ایک ہنسی ہو گئی۔ غرض دو سروں کی
تقلید کرنے میں نہ صرف اپنی بہت سی چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے بلکہ تقلید بھی
اوصوری نہ جاتی ہے۔ ہر قوم کے رسوم اس قوم کے تمدن، معیار زندگی
اور روایات کی مناسبت سے ہوا کرتے ہیں جن کو چھوڑنے کے یہ معنی ہیں کہ
قومی وقار اور روایات کو صدمہ پہنچایا جائے۔

تقلید کی توجہ ایک اور مثال سے ہو سکتی ہے۔ آج کل ہمارے پاس
یورپ کی (بلیغ میں) اہم تقاریب ہیں کا سب کچھ پہننے کا رواج ہے۔ درباری
لباس، عدالتی لباس، نوٹریادعوتوں کا لباس، مدارس اور کالجوں میں غلبہ و
مطالبہ کا لباس کاٹا ہے۔ اس سیاد پوشی کی غایت معلوم کرنے کے قبل ہمیں
یہ دیکھنا چاہیے کہ انگلستان میں آخر اس کا رواج کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ بات
ہے کہ ہر قوم کے لباس پر اس ملک کے تمدن، رسم و رواج اور آب و ہوا کا اثر

پڑتا ہے۔ انگلستان ایک سرورملک ہے، وہاں فضا، ہمیشہ گہرا آلودہ اور گرینیوں کے دہوں سے ہوا مکدر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں سفید کپڑے جلد میلے ہو جاتے ہیں اس طرح وہاں سیاہ کپڑوں کا پہننا فیشن نہیں ضرورت ہے۔ پھر ہندوستان میں لاسکی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب آسان ہے۔ یہ حاکم قوم کی ایسی تقلید ہے جس میں خود حاکم قوم کا فائدہ ہے۔ کیونکہ انگلستان کے کارخانوں کی رونق اسی میں ہے۔ اب ہم اس تقلید کے دوسرے پہلو پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ہمارا قدیم درباری، عدالتی یا تعاریب کا لباس ختم ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ساتھ اور بہت سی چیزوں کا خاتمہ ہو گیا۔ جس طرح ہندوستان کی وجہ سے آج یورپ کی گرینیوں کی رونق ہے اسی طرح کسی زمانہ میں ہمارے جلاہوں کے گھروں میں اُجالا تھا۔ اُن کا روزگار جاتا رہا۔ وہ یورپ کے جیسا کپڑا بنا نہیں سکتے اور ہم باہر سے خریدنے پر مجبور ہیں۔ اگر ملک میں یہ کپڑا تیار بھی ہونے لگے تو ہم باہر کے کپڑے سے مسابقت نہیں کر سکتے۔ وہاں کے کارخانے صدیوں سے قائم ہیں اُن کا معیار کارکردگی بڑھا ہوا ہے اور اُن کا تجربہ وسیع ہے۔ غرض اُن کا مقابلہ ہر لحاظ سے ہمارے لئے مشکل ہے اور معاشی و معاشرتی ہر حیثیت سے ہم خسارہ میں رہے۔

آزادی نسواں آزادی نسوان کے متعلق رائے سری کشن بیرسٹر کے خاص خیالات ہیں۔ آپ ہندوستان میں آزادی نسواں کی تحریک کے جو

یورپ کی اتباع میں ہو، حامی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارا ماحول، حالات اور روایات مختلف ہیں اور یورپ کے تمدنی سماجی اور معاشی تصورات ہم سے بالکل جداگانہ

یورپ کی عورتوں کی موجودہ سیاسی سماجی اور معاشی حیثیت نتیجہ ہے صدیوں کے ارتقاء کا۔ وہاں پر یہ تحریک دراصل معاشی کشمکش کی پیداوار ہے۔ انگلستان میں لہجاء آبادی مردوں اور عورتوں کا تناسب ۱۴:۱۰ ہے۔ اور قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے گویا تین عورتیں بے سہارا رہ گئیں جن کے لئے بجز کسب معیشت کے کوئی چارہ نہیں اور سوانحی میں اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے کے لئے انہیں اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ضروری ہے۔ اس طرح جب مرد اور عورت میں معاشی یکسانیت پیدا ہو جائے تو حقوق کا سوال پیدا ہونا ایک فطری امر ہے عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے اور یہ اس مشہور سیاسی ضرب المثل کے مطابق بھی ہے کہ بغیر نمائندگی محصول عائد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہندوستان میں نہ عورتیں معاشی حیثیت سے مرد کے برابر ہیں اور نہ ان کو رائے کی ضرورت ہے۔ محض اس لئے کہ انگلستان کی عورتوں کو حق رائے حاصل ہے ان کو بھی ہونا چاہیئے ایک غامض خیالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری عورتوں کو ترقی کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ترقی ہمارے اپنے ماحول، ہمارے اپنے حالات، روایات اور خصوصیات قومی کے تابع ہوگی۔ ہماری عورتوں کو یورپ کی عورتوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک مثال سے اس کی یوں توضیح ہو سکتی ہے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں تکلیف اور راحت، نشیب و فراز، تاریکی اور روشنی اور انسان کے پیش نظر ہمیشہ تاریک پہلو رہتا ہے کیونکہ اس میں اس کی آزمائش ہے۔ ہماری سوسائٹی میں غلی تربیت کے سلسلے میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے

وہ یہ ہے کہ انسان تکلیف میں ثابت قدم رہے۔ والدین اولاد کو، استاد شاگرد کو اور پیشوایان قوم اپنی قوم کو اسی کی تلقین کرتے ہیں اور یہ چیز ہماری تربیت کا ایک اصل اصول بن گئی ہے۔ اس معاملہ میں ہماری عورتیں مردوں سے زیادہ صبر و استقلال تحمل و بردباری اور تکلیف سہنے میں بڑھی ہوئی ہیں۔ عورت کے متعلق ہمارا یہ تصور ہے کہ وہ تکلیف کے لئے بنائی گئی ہے اور جب بچپن ہی سے یہ چیز اس کے ذہن نشین کرائی جائے تو اس میں لازماً سادگی، کفایت شعاری اور سکھڑن کی عادتیں پیدا ہونی چاہیں۔ اب عورت کی اس زندگی کو پیش نظر رکھ کر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہ خصوصیات کہاں تک برقرار رہتی ہیں۔ ہمارے مدارس کی طالبات بھٹان بدن اسراف کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں۔ پڑھائی سے زیادہ انہیں فیشن، آرائش، پکڑوں، ٹائلٹ اور جیب خرچ کا خیال ہے۔ آٹھ دن مدارس میں کچھ نہ کچھ تقاریب ہوتی رہتی ہیں اور لڑکیوں سے چندے وصول کئے جاتے ہیں۔ غریب سے غریب گھرانے کی لڑکی کو اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے ان کھیل تماشوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اگر آئندہ زندگی میں انہیں ایک عیش پسند زندگی میسر نہ آئے جس کے وہ آٹھ دن خواب دیکھا کرتی ہیں تو پھر ان کی گذر بسر کیسے ہو گی؟ کیا وہ چوری کریں یا فاحشہ بنیں۔ کیا وہ غیر محسوس طور پر تباہی کے تاریک گردھوں کی طرف نہیں ڈھکیلی جا رہی ہیں۔ اگر ہماری لڑکیاں تکلیف کے لئے تیار کی جائیں اور عملی زندگی میں انہیں راحت سے ساتھ پہنچے تو کیا یہ سونے پر سہاگہ نہیں ہے۔ دولت کی خیرگی سے وہ اندھی نہیں ہو سکتیں اور اپنی مصیبت زدہ بہنوں کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہو سکتا۔

اگر یورپ کی عورتوں کے نقش قدم پر چلکر آزادی حاصل کی جائے تو یہ آزادی کہاں رہی۔ آزادی تو ہر قسم کے تید و بند سے آزادی کا نام ہے۔ ایک اور خرابی ہماری سوسائٹی میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مغربی تعلیم اور تمدنی اثرات کیوجہ سے ہمارے مردوں کی ذہنیات میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ قدیم طرز کی مشرقی عورتیں اب اُنکے معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں اور مرد اُن کو کیسے اپنے معیار پر لانا چاہتے ہیں؟ آئے دن کا مظاہرہ ہے کہ کس طرح ہماری عورتیں باوجود مغربی تعلیم اور تمدنی اثرات سے براہ راست کوئی تعلق نہ رکھنے کے غیر محسوس طور پر مغربی اثرات کو قبول کرتی جا رہی ہیں۔ جس کی ذمہ داری بڑی حد تک مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں بہت سی ایسی مثالیں ملینگی کہ شادی کے بعد عورتوں نے مردوں کے اصرار پر پردے کو خیر باد کہہ دیا۔ اور باہر نکلنے کے بعد وہ فیشن کی دلدادہ بن گئیں کیونکہ اس کے بغیر وہ سوسائٹی میں گھل مل نہیں سکتیں۔ اُن کے اخراجات بڑھ گئے۔ اُن میں اسراف پیدا ہو گیا۔ اگر اس کے بعد مرد اپنی بیوی پر کچھ قیود اور پابندیاں عائد کرنا چاہے یا اس کے اسراف کو روکنے کی کوشش کرے تو یہ ناممکن ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بھول کا بیج بوکر آم کی توقع رکھنا۔ ہر عمل نیت کے ساتھ ہے۔ **الاحتمال بالنیہ** جو شخص جس نیت سے کام کرے گا اُس کو ویسا ہی پھل ملے گا۔

تعدد ازدواج | اب پر تبلا یا گیا ہے کہ یورپ میں قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے اور بلحاظ آبادی مرد اور عورت کا تناسب ایک اور چار ہے۔ جب چار میں سے تین عورتوں کا بیاہ نہ ہو سکے تو لازماً

سوسائٹی میں جنسی بے راہ روی پیدا ہو جا ایک فطری امر ہے اور اس کا سد باب اس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ وحدتِ ازواج کے قانون میں ترمیم نہ کی جائے۔ اسلام میں چار بیویوں کی جوازات دی گئی ہے اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کی شدید صورت حال کا مقابلہ کیا جائے۔ ہر قوم اور ملک کے تصورات اس ملک کے حالات کے مطابق ہوا کرتے ہیں اور مصلحان قوم یا حکومت، ان ہی حالات کو پیش نظر رکھ کر آئین و اصول مدون کرتی ہے۔ ایام جاہلیت میں عرب میں عورت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی اور وہ خرید و فروخت کی چیز تھی۔ حضرت محمد صلعم نے انھیں ایک حیثیت عطا کی۔ مردوں کو جنگی بیویوں کی تعداد غیر معین ہو کر رہی تھی ایک بیوی سے شادی کرنے کے لئے کہا گیا اور خاص حالات میں چار بیویوں تک کی اجازت دی گئی کیونکہ عربوں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے وہاں اس امر کی ضرورت تھی کہ انھیں ایک بیوی سے پابند کر دیا جاتا۔ لیکن جس ملک کے حالات ایسے نہیں وہاں اس قسم کے قانون کے نفاذ کی ضرورت بھی نہیں ہے انگلستان میں ایسے قانون کی ضرورت ہے مگر وہاں تعددِ ازواج کی مانعت ہے اور عملاً سوسائٹی میں یہ چیز موجود ہے۔

مشرقی عورت | ہندوستان میں عورت اور مرد میں کسی قسم کی معاشی کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دہرم شاستر کی رو سے شوہر زوجہ ایک روحانی وابہی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ شادی ایک مذہبی سنسکار ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شوہر کو اپنی زوجہ کی تمام ضرورتوں اور آسائشوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے بحیثیت استری وہ گھر کی مالکہ ہے۔ گھر کا سارا کاروبار اور

اور سارا انتظام اُس کے تفویض ہے۔ اُس کا سوامی اُس کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اُس کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ اسلام میں بھی ایسا ہی ہے۔ عورتوں کو وراثت میں حق حاصل ہے۔ وہ جائیداد کی مالک بن سکتی ہے اور اپنے کاروبار کو بلا شرکت غیرے انجام دے سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے ہماری عورتوں کے بہت سے حقوق مرد کے ہاتھوں پامال ہوتے ہیں اُن کی حق تلفیاں ہوتی ہیں لیکن وہ خاموش رہتی ہیں۔ یورپ کی حالت اُسکے بالکل برعکس ہے۔ وہاں عورتوں کو اس قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ اُنکے ساتھ سخت ظلم اور نا انصافیاں روا رکھی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تسلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ عورتیں حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اُن کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اکثر مردوں کو بھی اُن سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ جوں ہی ملک میں ہونق ماحول پیدا ہوا عورتیں آزاد ہو گئیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری عورتوں کو پہلے ہی سے حقوق حاصل تھے اور وہاں ایسے حقوق حاصل نہیں تھے لہذا اُن کے حصول کی کوشش کی گئی۔

تعلیمی معاملات | تعلیمی معاملات میں رائے سری کشن برسرِ کا خیال ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں تعلیم کے بنیادی اصول تقریباً ایک ہی ہیں جنہیں ہر قوم اپنے حالات، ماحول اور قومی ضروریات کے تحت اضافہ و ترمیم کر لیتی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں جو تعلیمی طریقہ رائج ہے وہ ٹھیٹھ انگریزی کی اتباع میں ہے جس سے ہماری قومی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ انگریزی تعلیم یا مغربی ادب سے استفادہ کرنے والے مارکزم، کمیونزم، بالٹوینزم اور اس قسم کے دیگر

”اینزم“ کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر ہندوستانی دماغ اس قسم کی تحریکات کی آماجگاہ بنیں جو یورپ میں بعض خاص حالات اور واقعات کے تحت پیدا ہوئی ہیں، تو ہندوستان کو ان سے کس قسم کا فائدہ پہنچتا ہے؟ کیا ہندوستان میں ان تحریکات کو بھی کامیاب ثابت ہونا چاہیئے؟ اور کیا ہمارے مختلف فیہ مسائل کا یہ صحیح حل ہو سکتی ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتی ہیں تو پھر ان کے پیچھے وقت ضائع کرنے کے کیا معنی ہیں؟ (اسی طرح شکسپیر، ملٹن، شیلی اور بائرن کی شاعری سے ہندوستانی طالب علم کو کیوں دلچسپی ہونے لگی جب خود ہندوستان نے ایسے بلند پایہ شاعر اور فلسفی پیدا کئے جن پر ہم رہتی دنیا تک فخر کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تعلیم اور مغرب کی ہر چیز کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ مشرق کی ہر چیز بیکار محض ہے۔ مثال کے طور پر آپ مغربی طب ہی کو لیجیے جس کے سامنے ساری دنیا کی طب فرسودہ ہو گئی ہی اور ہر ڈاکٹر اپنا یہ خوشگوار فرض سمجھتا ہے کہ وہ مشرقی طب کا جی کہول کر مضحکہ اڑائے کیونکہ جب تک یونانی اور عربی علاج کی خدمت نہ کی جائے اس کو روٹی نہیں مل سکتی۔

پیام انوجوانان ملک کے لئے رائے مری کشن بیرسٹر نے یہ پیام دیا ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کرنا چھوڑ دیں تقلید صرف ان لوگوں کے لئے سزاوار ہے جو تہذیب و تمدن میں تہی داناں ہوں۔ ہم لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے تقلید نہ صرف مضر ہے بلکہ خودکشی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر لطیف سعید

ڈاکٹر محمد عظیم سعید ایم۔ بی۔ سی ایچ (اڈنبرا) ملک کے ایک پتھے
بہم خواہ اور قومی لیڈر ہیں۔ ابتداً آپ سررشتہ طبابت سرکار عالی میں سیول جرن
تھے لیکن سن ۱۹۴۵ء میں اپنی خدمت سے استعفیٰ ہو کر آپ نے خانگی پریکٹس شروع
کی اور آج آپ ملک کے ایک مشہور و مسلمہ ڈاکٹر ہیں۔
آپ کا قیام انگلستان میں سن ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء رہا۔

انگریزوں کے خصوصیات | انگریزوں کی زندگی اور معاشرت میں سب
سے زیادہ قابلِ قدر ان کی راستبازی،
رض شناسی اور خانگی اور پبلک زندگی میں ضبط و نظم کا پایا جانا ہے۔ ایک انگریز کا
صرفوشی کا مسکن ہوتا ہے اور اس کو بجا طور پر خانگی زندگی کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔
یورپین سوسائٹی کی اخلاقی کمزوریوں کے متعلق مشرق میں جو ردایات مشہور
ہیں وہ بالکل غیر صحیح ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صنفی معاملات میں یورپ (اور انگلستان)

کا اخلاقی معیار کی طرح دوسرے ممالک سے پست نہیں ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ باوجود ہر قسم کی آزادی کے وہاں پر ”بد اخلاقی بہت کم ہے۔“

مغرب کے متعلق ہمارا دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ مادہ پرست ہے اور روحانیت سے اُسے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ روحانی زندگی کے متعلق اہل یورپ کا نقطہ نظر ہم سے جداگانہ ہے۔ معاشری خدمت گزاری، آیشارا اور ہمدردی وہاں کی زندگی کے عام اصول ہیں اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے ”سوسائٹی کی برائیاں“ دور ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں مذہب کا اتنا چرچا نہیں ہے اور لوگ اپنی مذہبیت کی نمائش بھی نہیں کرتے لیکن مذہب سے انسان میں جو خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اُن میں موجود ہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگ جو یورپ جاتے ہیں وہ یورپین زندگی کی اصل روح کو محسوس نہیں کرتے۔ ہم محض صورت پر جاتے ہیں اور ہماری انتہا یہ ہوتی ہے کہ اہل یورپ کے ظاہری خط و خال کی نقالی کر لیں۔ اور اس کا بھی حق ہم پوری طرح ادا نہیں کرتے۔

یورپ سے ہم ایک اچھا سبق سیکھ سکتے ہیں اور وہ متحدہ زندگی میں نظم اور باقاعدگی کا پیدا کرنا ہے تاکہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ تعداد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔

مولوی سید حیدر رضا خاں زیدی

مولوی سید حیدر رضا صاحب زیدی ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹر لا
غالباً وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو بالکل بے سروسامانی کے عالم میں انگلستان پہنچے
اور محض اپنی قابلیت سے نہ صرف کھایا کیا بلکہ اعلیٰ ترین تعلیم بھی حاصل کی۔ اور
اس کے بعد انگلستان ہی میں متوطن ہو کر بیرسٹری شروع کر دی۔ اپنے تیس سال
کے طویل قیام میں آپ نے بہت غائر نظر سے یورپ کے حالات کا مطالعہ کیا
انگلستان سے مراجعت کے بعد آپ نے حیدر آباد میں پریکٹس
شروع کی ہے۔

آپ کا قیام یورپ و انگلستان میں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۷ء رہا۔

حُب الوطنی | یورپ کی ترقی اور عروج کا راز حُب الوطنی میں مضمر ہے۔
اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اہل یورپ کو اپنے وطن سے
کس درجہ محبت ہے۔ اس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اہل یورپ اپنے مقابلہ میں نیکی

کسی قوم کو عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے چنانچہ انگریز عام طور پر امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے باشندوں کو جو ان کے سنگے بھائیوں کے برابر ہیں، حقیر سمجھتے ہیں اور ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

لئے جذبہ خدمت گزاری ملک اور قوم کی خدمت کرنے کا اہل یورپ میں جو دلیہ پایا جاتا ہے وہ ہمارے یہاں ناپید ہے۔ یہاں ایشیا کی بہت کم مثالیں نظر سے گذرتی ہیں۔ انگلستان میں رشوت ستانی کا ایس نام نہیں۔ معمولی جوان کو توالی سے لیکر حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار کا یہی حال ہے۔

جذبہ حق پسندی جذبہ حق پسندی میں بھی اہل یورپ کو ہمارے مقابلہ میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ وہاں ہر شخص اپنے اور دوسروں کے معاملات میں حق اور انصاف کا حامی رہتا ہے۔

جذبہ مساوات اہل یورپ آپس میں بلا تفریق ایک دوسرے سے مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے رؤسا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے کیسی برتر و بالا نہیں ہیں۔ لوگ خود غرض نہیں ہیں کسی ایجاد یا اختراع کو چھپا کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کو عام کر دیا جاتا ہے تاکہ ملک اور قوم کو اس سے فائدہ پہنچے۔

معیار زندگی اہل یورپ کی زندگی دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں گہری کی طرح پابند اور باقاعدہ ہے اور لوگوں میں فوجی قسم کی ترتیب اور باقاعدگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ غرض انسان وہاں اپنے عمل میں

شین سے کم نہیں ہے۔ اہل یورپ کی ضروریات زندگی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ کھانے اور کپڑے پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر سرد ممالک میں صحت اور توانائی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس اعلیٰ اور بلند معیار زندگی کی وجہ سے وہاں لوگوں کی تنخواہیں بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ لندن کے معمولی پولس کے جو ان کی تنخواہ چار پونڈ ہفتہ وار یا تقریباً دو سو پچاس روپیہ ماہانہ ہوتی ہے۔ وہاں ہر شخص روزانہ عادتاً ورزش کرتا ہے۔ شام میں عام طور پر لوگ ورزش کی خاطر میاں پیدل چلتے ہیں۔ اور ہفتہ اور اتوار کے دن تو جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں۔

قانون کی پابندی | انگلستان میں قانون کا جتنا احترام کیا جاتا ہے اُن کی کسی دوسرے ملک میں نہیں کیا جاتا۔ قانون کی نظر میں امیر

وغریب، حاکم و محکوم سب برابر ہیں کبھی قسم کے اثر و سفارش کو دخل نہیں ہے اس کی توضیح ذیل کے واقعات سے ہو سکتی ہے۔

لندن کے ایک خطاب یافتہ مددگار کو تو ال جب برسوں کی ملازمت کے بعد وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو دوسرے ہی روز پولس نے اُن کا چالان اس الزام میں کیا کہ ہائیڈ پارک میں وہ ایک عورت کیساتھ قابل اعتراض حالت میں پائے گئے۔ کسی قسم کے اثر و سفارش سے کام نہیں چلا اور عدالت نے سزائے جرمانہ صادر کر دی۔ ایسی طرح کینٹ کو نسل کے ایک مستقل معتد پر بھی پولس نے اسی قسم کا الزام لگایا اور باوجود اُن کے اثر اور رسوخ کے مقدمہ معمولی طور پر چلا۔ انگلستان میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں ملینگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون کی یہ سختی اور

غیر تغیر پذیریری لوگوں کے لئے باعث تکلیف ہے۔ اگر کسی شریف آدمی سے اتفاقی طور پر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے سزا بھی دیجائے کیونکہ ایسی صورت میں جرم کا اعلان ہی اُس کے لئے کافی سزا ہے۔

عورتیں | مولوی حیدر رضا صاحب ذاتی طور پر عورتوں کی آزادی کے خلاف ہیں کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے گا۔ یورپ میں عورتوں کی آزادی کا ادنیٰ مظاہرہ سمندری تفریح گاہوں پر نظر آتا ہے جہاں پر ہزار ہا عورتیں نہانے کا جاسوز لباس پہنے ہوئے اپنے حسن اور رغبتوں کی نمائش کرتی ہیں۔ ان عورتوں کی آنکھوں میں نسوانی شرم و حجاب کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بسا اوقات اس عریاں لباس میں عورتیں بازار جاتی ہیں اور اس لباس میں بعض عورتوں کی شادیاں بھی ہوئی ہیں۔ لباس اس قدر چُست ہوتا ہے کہ جسم کی ہر چیز آئینہ کی طرح نظر آتی ہے۔

مغربی عورتوں کی آزادی | میرے اس سوال پر کہ مغربی عورتوں کی اس آزادی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مولوی حیدر رضا صاحب نے فرمایا کہ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلے عورتوں کا سماجی حیثیت سے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ہے جس کی وجہ سے والدین کا اُن پر کوئی اثر نہیں رہا۔ شہروں میں اکثر ملازم پیشہ عورتیں قصبوں اور دیہاتوں سے آتی ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا اور وہ شہر کی دلچسپیوں میں کھو جاتی ہیں۔ بعض نوجوان لڑکیاں اپنے ضعیف والدین کی پرورش کے خیال سے ملازم ہو جاتی ہیں اور چونکہ ملازمت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔

اس لئے انہیں مجبوراً اپنے بوالہوس آقاؤں کی ہرجائز دنیا جواز خواہش پوری کرنی پڑتی ہے۔ ایک جرمن رئیس کے قول کے مطابق انگلستان اور امریکہ کی ہر دوکان ایک حرم سرا ہے۔

(عورتوں کے اخلاق خراب ہونے کی ایک اور وجہ ریل، موٹر اور تیسرے سواریاں ہے۔ غریب گھرانوں کی لڑکیاں عموماً موٹروں میں بیٹھنے کی بڑی شائق ہوتی ہیں اس لئے اگر سربراہ انھیں کسی موٹر میں مفت جگہ دیجائے تو اس کے نتائج پر غور کئے بغیر وہ موٹروں میں سوار ہو جاتی ہیں اور موٹریں تفریح کے بہانہ سے انھیں دور لیکر نکل جاتی ہیں۔ اور بعد میں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تفریح کی انھیں بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ چند دنوں پہلے امریکہ کی بعض ناکتخدا لڑکیوں نے خودکشی کر لی تھی جس کی پولس نے اپنی تحقیقات میں یہ وجہ بتلائی کہ یہ حاملہ ہو گئی تھیں اور ایسے مردوں کے ساتھ ان کی موٹروں میں تفریح کو جایا کرتی تھیں جن کے نام تک انھیں نہیں معلوم تھے۔ اس طرح استقلاط حمل، خفیہ زچگی یا عاشقی کرنے کے لئے بھی آجکل بڑی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں عورتیں تفریح کے نام سے براعظم چلی جاتی ہیں اور کچھ دنوں بعد بغیر کسی بدنامی کے وطن واپس ہو جاتی ہیں۔

ناچنے سے بھی عورت اور مرد کے اختلاط کے زیادہ مواقع پیدا ہوتے ہیں اس میں جہانی ہی میں اختلاط کی بہت سی منزلیں ملے ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں عصمت کا کوئی معیار نہیں ہے۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں قسم کی عورتوں میں۔ ہندوستان میں مستعدا اگر کہیں رواج ہے تو چند قیود اور پابندیوں کے ساتھ لیکن یورپ میں تو کوئی

قید ہی نہیں۔ امریکہ میں تو ایک معینہ مدت کے لئے امتحانی شادیاں ہو رہی ہیں۔ انگلستان میں شادی تک اور فرانس میں شادی کے بعد عورتیں اپنے آپ کو قہریم کے بندھن سے آزاد سمجھتی ہیں۔ انگریز عورتوں کے کردار کی صحیح ترجمانی مشہور شاعر یورپ کے اس مصرعہ سے ہو سکتی ہے کہ ”ہر عورت کی ایک قیمت ہے۔ وہاں کسی عورت کا حاصل کرنا مشکل نہیں البتہ معیار زندگی اور طرز ماند و بود کا فرق ہے۔ عورتوں کی اس آزادی کی وجہ سے اہل یورپ کی ذہنیات میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ذیل کے ایک معمولی واقعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ مولوی حیدر رضا صاحب ایک بس میں بیٹھے ہوئے لندن کے مضافات سے تشریف لارہے تھے۔ راستہ میں ایک اسٹیشن پر کچھ لوگ سوار ہوئے جن میں ایک بوڑھی ماں اور اس کی جوان بیٹی بھی تھی۔ ماں کو تو بیٹھنے جگہ مل گئی لیکن بیچاری لڑکی کھڑی رہی۔ چونکہ سفردور کا تھا ماں نے ادھر ادھر دیکھ کر بد آواز بلند بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا:-

”بیٹی! تو ایسی کب تک کھڑی رہیگی۔ جا اس نوجوان کی گود میں بیٹھ جا۔

تجھے بیٹھنے جگہ مل جائیگی اور وہ خوش ہو جائیگا“

چنانچہ سعادت مند بیٹی نے خوشی سے اچھل کر اپنی ماں کے حکم کی

تعمیل کی۔

خانگی زندگی

عورتوں کی آزادی کی وجہ سے اہل یورپ کی خانگی زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ اگلے زمانہ میں عورت اپنے شوہر کی محکوم سمجھی جاتی تھی اور مشرق میں تو خدا کے بعد شوہر کا درجہ ہے۔ لیکن یورپ میں

مالیات بالکل برعکس ہیں۔ وہاں شوہر بیوی کا محکوم سمجھا جانے لگا ہے۔ یورپ میں یہ ایک عام فیشن ہو گیا ہے کہ اپنے مرد احباب کے سامنے عورتیں اپنے شوہر کا مضحکہ اڑاتی ہیں اور ان کی کمزوریوں کو چھپانے کی بجائے ان کو نمایاں کر کے پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح سیر و تفریح کے لئے عورتیں بہت کم اپنے شوہروں کے ساتھ باہر نکلتی ہیں۔ عورتوں کے ملازمت اختیار کر لینے کی وجہ سے مردوں کو امور خانہ داری میں دلچسپی لینا پڑتی ہے ورنہ گھر کا انتظام اور بچوں کی نگہداشت ناممکن ہو جاتی ہے۔

عورتوں کی اس بڑھتی ہوئی آزادی کو روکنے کے لئے شہر وائیاں ایک انجمن زنِ مردیاں قائم ہوئی ہے جس میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے زنِ مرید شریک ہیں۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ سیطرہ پھر عورتوں پر مردوں کا تسلط قائم ہو جائے۔ جرمنی میں نازی حکومت نے عورتوں پر سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ ملازمت کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں اور ان کے ذمہ گھر کا انتظام ہو گیا ہے۔

جنگِ عظیم سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۱۳ء میں انگلستان میں طلاق کی اوسط تعداد (۶۰۰) سالانہ تھی جو بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ آج اس کا اوسط پانچ ہزار ہے۔ جرمنی کا اوسط ۶۰ ہزار امریکہ کا ایک لاکھ اور روس کا ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ انگلستان میں تقریباً ۵۰۰۰ طلاقیں خود عورتوں نے حاصل کیں۔

عورت اور جنگِ عظیم | میرے اس سوال پر کہ جنگِ عظیم کا اخلاق پر کیا اثر پڑا آپ نے فرمایا کہ یورپ میں اخلاق کا

جنازہ جنگ ہی نے نکالا ہوا زمانہ جنگ میں یورپ کا ہر ملک نوجوانوں سے خالی تھا اور عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چنانچہ جسٹس ڈارلنگ کے بیان کے بموجب جو اس زمانہ میں لندن بائی کورٹ کے جج تھے عورتوں کی حالت کا اندازہ لکھ کر پریکٹس جاسکتا تھا جہاں وہ مردوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ اور اس زمانہ کا یہ فیشن ہو گیا تھا کہ ایک مرد کے ہمراہ سیر و تفریح میں دو عورتیں ہیں۔ مردوں کی اس قلت کے مد نظر جرمنی میں ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں مردوں کے لئے قانوناً تعدد ازواج کی حمایت کی گئی تھی۔

بہر کیف یورپ کی عورتوں کی آزادی اور بے راہ روی دیکھنے کے بعد یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ عورتوں کو آزاد ہونے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ اُن کی تعلیم پر روپیہ صرف کرنا بیکار ہے اُن کی تعلیم بس اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ مذہب سے واقف ہو جائیں اور گھر کا کاروبار آسانی سے سنبھال لیں۔ خود انگلستان میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم پر زیادہ رقم نہ صرف کی جائے۔ انگلستان میں اس وقت پانچ ہزار لیبیری ڈاکٹر ہیں اور اس تعداد میں مزید اضافہ نہ ہونے کے لئے تقریباً تمام طبی کالجوں میں عورتوں کے داخلہ پر تحدید عائد کی گئی ہے۔

مذہب یورپ پر مذہب کا کوئی اثر نہیں تعلیم یا نہ تہلیک کے سمجھنے سے قاصر ہیں یہی وجہ ہے کہ وہاں مرد بہت کم گرجاؤں کو جاتے ہیں اور جو جاتے بھی ہیں تو محض اپنی بیویوں کے جبر سے یا اُن کو خوش کرنے کے لئے۔ لیکن مذہب کا اثر نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں خدا کے پرستار ہی نہیں ہیں۔ خدا ترسی وہاں کے لوگوں کی ایک عام خصوصیت ہے۔ خیانت، ہمدردی، ایثار اور

اس قسم کی دیگر خصوصیات میں وہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔
یورپ کا مستقبل | سردست یورپ میں اس خطاط کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں عیش پرستی زیادہ ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ قوم پرستی ہے۔ مسلمانوں کے اس خطاط کی اگر کوئی وجہ تھی تو یہ تھی کہ ان میں خدمت عامہ کا جذبہ تقریباً مفقود ہو گیا تھا۔ وہ جو کام کرتے یا تو جلب منفعت کے لئے کرتے تھے یا اپنے آقاؤں یا بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر۔ جب انسان کا مسلح نظر اتنا گر جائے تو ظاہر ہے کہ ذہنی اور تمدنی حیثیت سے اس کا ترقی کرنا محال ہے۔ مولوی حیدر رضا صاحب کا ذاتی خیال ہے کہ کچھ دنوں بعد یورپ سے مستقل شادیوں کا رواج اٹھ جائیگا اور ہر کمرس کے زمانہ میں مرد اور عورتیں ایک سال کیلئے اپنے رفیق کا انتخاب کر لیا کریں گے۔

تقلید | اہل یورپ کی بہت سی چیزیں ہمارے لئے قابل تقلید ہیں لیکن یہ بہت بیک نظر دکھائی نہیں دیتیں اور نہ تین چار سال کے قیام میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ یونان کی برائیاں جہاز سے اترتے ہی نظر آنے لگتی ہیں اور ہم ان ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی خوبیاں ہمارے لئے پردہ میں رہتی ہیں۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے طالب علم اور سیاح ایسی عمر میں یورپ جائیں جب وہ اپنی خواہشات نفسانی پر قابو رکھ سکتے ہوں اور اس کے لئے کم از کم (۴۰) سال کی عمر کو پہنچنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یورپ میں دو ایک سال کے قیام سے ملحق چیزوں پر بھی نظر نہیں پڑتی۔ وہاں پانچ دس سال رہنے کی ضرورت ہے جس کے بعد ہی لوگ کچھ صحیح رائے دینے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (اکسن) ناظم تعلیمات سرکار عالی ایک وسیع تعلیمی تجربہ کے مالک ہیں۔ آپ نے فن تعلیم پر کئی بلند پایہ کتب و مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ آپ کی کتابوں میں سب سے اہم و قابل ذکر ”ڈنمارک کا طریقہ تعلیم“ ہے۔ یہ کتاب آپ نے بزبان انگریزی ڈنمارک کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر کے تالیف فرمائی ہے۔

اپنے قیام آکسفورڈ میں آپ وہاں کی اسلامک سوسائٹی کے معتد اور اس کے بعد اس کے صدر نشین رہے اور جنگِ بھقان کے وقت انجمن ہلالِ احمر کے کام میں عملی حصہ لینے کے لئے آپ ترکی تشریف لے گئے۔ آپ کا قیام انگلستان میں ۱۲۸۶ تا ۱۲۸۷ء رہا۔

خصوصیات اہل یورپ میں اور ہم میں بڑا فرق ہے۔ دُور کیوں جائیے بعض مشرقی ممالک مثلاً ترکی، ایران، مصر و عراق بھی ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ہم پر ابھی جمود کی گھٹا طاری ہے اور قدامت پرستی نے

ہیں تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حالات زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔ اہل یورپ میں خدمت خلق کا مادہ زیادہ ہے اور ہم میں خود غرضی زیادہ ہے۔ وہاں اجتماعی زندگی پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں انفرادی زندگی پر۔ اس کی توضیح یوں ہو سکتی ہے کہ اگر ہم کسی ذمہ دارانہ خدمت پر ہوں تو ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے قدم بجائے رکھیں خواہ اُس میں بحیثیت مجموعی مفاد عامہ کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

مذہب یا قومیت | ہندوستان میں مذہب پرستی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہم نے مذہب کو قومیت بنا لیا ہے اور ہماری قومیت کا دار و مدار مسلمان اور ہندو ہونے پر ہے درآئیں ایک قوم جغرافی حیثیت سے قائم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مذہب کو ہر معاملہ میں اولیت حاصل ہے اور یورپ میں مذہب ایک بالکل شخصی چیز ہے جس طرح ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی مشغلہ منتخب کر لے بعینہ ہی حال وہاں مذہب کا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ باپ کا جو مذہب ہو وہی بیٹے کا بھی ہو۔ اور نہ مذہب کی وجہ سے دنیوی کاروبار میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اگر میں شیعہ ہوں اور آپ سنی ہیں تو اس سے آپس کے تعلقات اور معاملات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اعتقاد کی حد تک آپ کسی مذہب کے پابند رہیں لیکن جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے یہ کافی ہے کہ آپ کا ضمیر آپ کا ساتھ دے۔ لیکن ہمارے پاس ایسا نہیں ہوتا۔ ہم نے مذہب کو رحمت کے بجائے زحمت بنا لیا ہے۔

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے اپنے حالیہ سفر عراق کا ایک واقعہ

بیان فرمایا کہ عراق کی آبادی مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل ہے لیکن سب کی زبان عربی ہے اور سب اپنے آپ کو پہلے عراقی سمجھتے ہیں۔ جب حکومت عراق نے جبری نوچی بھرتی کے وقت عیسائیوں کو نظر انداز کر دیا تو پچیس تیس ہزار عیسائی نوجوانوں نے دفتر خارجہ کے سامنے مظاہرہ کیا یہ بتلانے کے لئے کہ عراق کی مدافعت کا فرض مسلمانوں کے برابر عیسائیوں پر بھی عائد ہوتا ہے جس سے وہ محروم نہیں کئے جاسکتے۔ حکومت کو مجبور ہونا پڑا۔ برخلاف اس کے ہمارے پاس اکھاڑے قائم ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے۔

ذاتی خصائص | عام طور پر یہ خیال ہے کہ یورپ کی اخلاقی حالت خراب ہوگئی ہے۔ یورپ میں اقوام ظلم و تعدی کے علمبردار ہیں اور کمزور قوموں کی حمایت کی بجائے ان کے خلاف زیادتیاں روا رکھی جاتی ہیں۔ اطالیہ اور جرمنی اس کی زندہ ترین مثالیں ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی ظلم اور زیادتی کا تعلق قومی یا عالمی سیاسیات سے ہے۔ انفرادی طور پر وہاں کے لوگوں میں ایسا اور خدمت خلق کا مادہ زیادہ ہے اور ان کی یہی خصوصیات ان کی ترقی کی ضمانت ہیں۔ گو وہاں کے لوگ مذہب کے اتنے پرستار نہیں ہیں لیکن مذہب کی تعلیمات سے کسی شخص میں جو اچھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں وہاں کے رفاہی اور خیرانی اداروں کی تعداد کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ مشرق میں بہت سے ایسے لوگ ملینگے جو صوم و صلوات کے پابند، متشروع، عالم سب ہی کچھ ہیں لیکن ان کی ذات سے ان کے سوا کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا پھر ایسی مذہبیت سے کیا فائدہ جب انسان اپنے سوا دوسروں کے کام نہ آسکتا ہو۔

انگریزوں کی ذاتی خصوصیات | انگریز دنیا کی بہترین قوموں میں سے ہیں۔

سنجیدگی، توازن، دماغی اور حکمت عملی میں یہ لوگ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہندوستان پر ڈیڑھ سو سال کے انگریزی تسلط کے بعد بھی ہندوستانیوں کو انگریزوں کے توازن دماغی کی ہوا نہیں لگی۔ معمولی معمولی چیزوں پر ہم الجھ جاتے ہیں اور بجائے تعمیر کے تخریب کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ سب سے پہلے انگریزوں کی یہ خصوصیت اپنے آپ میں پیدا کریں بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہمارے جذبات جلد براہِ نگیختہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ایک حد تک صحیح ہو لیکن اگر کسی چیز کے حصول کی کوشش کی جائے تو اس کا حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔

تعلیم | جنگ عظیم کے بعد یورپ کے حالات میں جو زبردست رد و عمل ہوا اس سے یورپین ممالک نے محسوس کیا کہ ملک کی سب سے بڑی دولت نوجوان ہیں۔ تعلیم یافتہ اور صحت مند۔ آج یورپ کے ہر ملک میں نوجوان اور ان کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔

دماغی اور جسمانی تعلیم کو برابر کی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی درگاہوں میں اوقاتِ مدرسہ میں طلباء کے لئے کھانے کا مفت انتظام کیا جاتا ہے اور انھیں بہترین غذا دی جاتی ہے۔ ان کا مفت طبی معائنہ ہوتا ہے اور ان کے لئے صحت خانے قائم کئے گئے ہیں۔

ہر متمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو ابتدائی تعلیم دلائے۔ یورپ میں ابتدائی تعلیم کی حد تک حکومتیں ساری ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ ثانوی اور اعلیٰ

تعلیم کے لئے خانگی کوششوں اور خانگی سرمایہ کو دخل ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کی آبادی تقریباً ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اور وہاں صرف ابتدائی تعلیم کا خرچ دس کروڑ پونڈ سالانہ ہے گویا فی کس تعلیم کا خرچ دو پونڈ یا تیس روپیہ ہوتا ہے۔ ہماری ریاست کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے اور تعلیم پر تقریباً ایک کروڑ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں ہم کس قدر پیچھے ہیں۔ ہندوستان میں فوج پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے کاش وہ نوجوانوں کی تعلیم پر صرف کی جاتی کیونکہ کسی ملک کی بڑی فوج اس کے نوجوان ہیں اور جب یہ تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر ہوں تو پھر اس فوج کے ہوتے ہوئے اس ملک کو کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔

عورت | لیکن تعلیم صرف اچھائیوں کی حد تک ہونی چاہیے۔ ہماری عورتوں کو سب سے پہلے کفایت شعارانہ زندگی کا عادی بننا چاہیے۔ غیر معمولی قیمتی لباس زیب تن کرنا، بناؤ شکھار اور نمائش پر جان دینا، گھر کا کاروبار چھوڑ کر پارٹیوں اور سوسائٹیوں میں شریک ہونا ایسی چیزیں ہیں جو نہ صرف ہندوستان میں بری نظروں سے دیکھی جاتی ہیں بلکہ یورپ میں بھی انہیں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال کہ یورپ کی ہر عورت عصمت باختہ سے غلط ہے۔ وہاں عورت اور مرد مساوی طور پر آزاد ہونے کی وجہ سے عورت میں عصمت کا خیال زیادہ ہے۔ اگر کسی شخص کو ہمیشہ کمرہ میں بند رکھا جائے اور اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ انتہائی نیک چلن ہے تو یہ ایک قسم کی ستم ظریفی ہے۔ نیک چلنی یا بد چلنی کا

اندازہ تو اس وقت ہو سیکے گا جب وہ شخص ہر قسم کے قید و بند سے آزاد رہنے کے بعد اپنے دامن کو معصیت سے آلودہ نہ کرے۔ بعینہ ہی حال ہماری عورتوں کا ہے یورپ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو رین بسیروں کے دلدادہ ہیں اور دوسرے جو لہو و لعب میں حصہ نہیں لیتے۔ اوپنے طبقوں میں عیش پرستی زیادہ ہے۔ لیکن متوسط اور اعلیٰ متوسط طبقہ انگریزی سوسائٹی کی ریڑھ کی ہڈی اور اُسکی جان ہے انگریزوں کی ساری قومی خصوصیات، روایات اور احساسات کا یہی طبقہ ائینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انگریز عورت بد اخلاق ہوتی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے تو یہ قوم زندہ بھی نہیں رہتی۔ کیا تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عیش پرستیوں اور بد اخلاقیوں سے تو میں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

مسلمان عورتوں کے مقابلہ میں ہندو عورت کی زندگی بہت کفایت شعارانہ ہے۔ پونہ و بھنبی میں کئی نسوانی ادارات و مدارس ایسے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو عورتیں معمولی معمولی معاوضہ پر کام کرتی ہیں اور انکے اس ایثار اور محنت پسندی میں ایک نئی قوم جنم لے رہی ہے۔

ہماری عورتوں کی ترقی بڑی حد تک مردوں کی ذہنیات کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ غیر عورتوں یا ان عورتوں کے متعلق جو بے پردہ ہیں ہمارے خیالات اتنے ارفع و اعلیٰ نہیں ہوتے جتنے کہ خود اپنے گھر کی عورتوں کے متعلق ہوتے ہیں۔

آخر میں مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے فرمایا کہ ہندوستان کی خاتمہ ترقی کے لئے سخت ترین اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج سے دس سال قبل ایرانیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

وہ ایفون او قبوہ کے عادی تھے۔ افلاس زدہ، جاہل اور خوابیدہ۔ لیکن رضا شاہ نے ان میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ اس بیداری کی بجز اس کے کوئی وجہ نہیں کہ رضا شاہ نے ملک کے لئے جس اصلاح کی بھی ضرورت محسوس کی اس کو بغیر کسی پس و پیش کے نافذ کر دیا گیا اور اس سے سرتابی کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ ترکی میں اتاترک اور ایران میں رضا شاہ نے گونگی ذہنیاتوں اور ان کے نصب العینوں کو بدل دیا ہے اور ایک تاراج اور غلوک حال قوم سے ایک زندہ اور الو العزم قوم کو پیدا کیا۔

مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب

مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی (لندن)
اے۔ اے۔ سی۔ ایس کی علمی و ملکی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں بحیثیت
صدر کلید جامعہ عثمانیہ بارہ سال تک آپ نے جس جوش اور خلوص سے اس
فوزیر جامعہ کو سچے راستوں پر گامزن کیا ہے اور نوجوانان ملک کی قسمتوں کی
رہنمائی فرمائی ہے آپ کے اس احسان سے جامعہ اور حیدر آباد کبھی مجبور
نہیں ہو سکتا۔

آپ ہندوستان کے ایک سلسلہ سائنس دان ہیں۔ اور سائنس کی ترقی
بلند پایہ نصابی کتب کو آپ نے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔ ذلیف کے بعد آپ
انکلیڈ علی اور اسٹنڈنگ کاموں کے لئے وقف ہو گئے ہیں۔ آپ کے مضامین
و مشاہدات مشہور امریکی و برطانوی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ حیدر آباد و کچنل
کا فرض کی گذشتہ میقات کے آپ صدر تھے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۳۱۴ء رہا۔ ۲۴ عید میں بھی
آپ نے دوسری مرتبہ یورپ کا سفر فرمایا ہے۔

عام خصوصیات | اکثر یورپی اقوام اور خصوصاً انگریز بہت سی ایسی خوبیوں کے حامل ہیں جو ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور نشوونما ہی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ وطن پروری، الواعزمی، شجاعت، ہمدردی، ایثار، عورت نفس، خود داری، ضبط و تنظیم جیسی خصوصیات ان کی فطرت میں پرج گئی ہیں ان چیزوں کا عمومیت سے ہر کس و نا کس میں موجود رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یورپ ہمارے مقابل میں کتنا ترقی یافتہ ہے۔

باقاعدگی | نصب العین ہیں۔ معمولی معمولی چیزوں میں اتنی باقاعدگی برتی جاتی ہے کہ اس سے انگریزوں کی عام تنظیمی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک معمولی تفریح (picnic) کو بھی نکلتے ہیں تو لوگ پہلے ہی سے اس کا پروگرام بنالیتے ہیں اور اگر کوئی دور دراز کا سفر ہو تو راستوں کا نقشہ تک تیار کر لیا جاتا ہے۔ تفریح کے لئے اگر زیادہ لوگ جا رہے ہیں تو ایک لیڈر کا بھی انتخاب کر لیا جاتا ہے جس کے احکام کی ایسی ہی تعمیل ہوتی ہے جیسے پایا ہی اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پروگرام سے یہ لوگ رفق برابر ہٹنے نہیں پاتے۔

انگریز وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ کوئی شخص بیکار نظر نہیں آتا۔ دولت مند اور ذی ثروت لوگ بھی جنہیں سبز عیش کے کوئی کام نہیں، کچھ نہ کچھ قومی اور رفاہی کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں یا اپنے لئے کوئی ایسا مشغلہ منتخب کرتے ہیں کہ ان کا وقت بیکار نہیں جاتا۔ اس ضرب المثل سے کہ ایک بیکار دماغ شیطانی کا رخا نہ ہو، وہ خوب واقف ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں مبادا الکل دماغ

شیطان کی آماجگاہ بن جائے۔

کفایت شعاری | انگریز انتہائی کفایت شعار ہوتے ہیں اور ایک ایک کوٹری جمع کرتے ہیں۔ دولت کی قدر کرنے ہی سے یہ لوگ دولت مند

ہیں۔ کفایت شعاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے ایک معمولی واقعہ بیان فرمایا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بچپن ہی سے اس عادت کو کس طرح راسخ کیا جاتا ہے۔ انگلستان پہنچنے کے بعد ایک خاندان میں آپ کی رہائش کا انتظام ہوا۔ پہلی مرتبہ جب آپ نے اس مکان میں قدم رکھا تو چائے کا وقت تھا میز پر خاندان کے سارے ارکان اور بچے جمع تھے۔ آپ بھی شریک کر لیے گئے۔ آپ کے لئے چائے بناتے ہوئے مالک مکان نے دریافت کیا کہ آیا آپ کو شکر کی ایک ڈلی (دکعب) کافی ہو جائیگی یا دو؟ آپ نے فرمایا ”دو“ اس کے بعد بچوں کی باری آئی۔ سب سے بڑے لڑکے نے ’ایک‘ کہا اور چھوٹوں نے تو شکر لینے ہی سے انکار کر دیا۔ آپ تعجب سے بچوں کی صورت دیکھنے لگے تو والدین کا غصہ ان پر ایسا طاری تھا کہ کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہ ہوتی تھی حالانکہ شکر کے لئے ان کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ یہ دراصل ان کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ یہاں کی طرح نہیں کہ بچہ جو ضد کرتا ہے اس کو پوری ہی کر کے رہتا ہے اور رفتہ رفتہ والدین کے لاڈ پیار سے تباہ ہو جاتا ہے۔

صفائی اور نفاست پسندی | انگریزوں کی صفائی اور نفاست پسندی کے متعلق آپ نے ایک واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ ایک روز آپ اپنے کمرے میں بیٹھے منہل تراش رہے تھے۔ کمرے

مالک مکان کی موجودگی کا آپ کو علم نہ تھا۔ جوں ہی اس پر نظر پڑی تو آپ نے دیکھا کہ وہ آپ کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑی ہے اور قلم کے بڑوں کو اپنی ہتیلی میں جمع کرتی جا رہی ہے۔ جب آپ نے اس کی اس حرکت پر تعجب کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگی کہ کیا مالک فرش پر پڑے رہنے دینے سے باہر پھینک دینا اچھا نہیں ہے۔ اس واقعہ سے آپ اتنے متاثر ہوئے کہ اس عورت سے زیادہ کمرے کی صفائی کا آپ کو خیال ہو گیا۔

انگلستان میں اکثر مکانوں میں غسل خانے نہیں ہوتے۔ لوگ عام طور پر اتوار کو نہاتے ہیں یا اسینج باٹھ پر اکٹھا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے گو مشرقی نقطہ نظر سے یہ صفائی ظاہری ہوتی ہے۔

آزادی نسواں | میرے اس سوال پر کہ جنگ کے پہلے اور بعد عورتوں کے حالات میں کیا نمایاں تغیر واقع ہوا مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے فرمایا کہ جنگ عظیم سے پہلے عورتیں ہر قسم کے قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں اور جنگ کے بعد انھوں نے اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل کر لی۔ چنانچہ آج انگلستان میں عورتیں ہر کام میں مردوں کے روش بدوش ہیں۔ لیکن جب معاشی حیثیت سے عورت اور مرد ایک سطح پر آجائیں تو لازمی طور پر گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور یورپ میں آج اسی کا ماتم ہے۔ ہندوستان کے گھر کی زندگی اور آسودگی یورپ میں خواب و خیال ہیں۔ آزادی اور انفرادی ذمہ داری کے احساس نے وہاں کے ہر شخص کو خواہ مرد ہو یا عورت اپنے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ جی وجہ ہے کہ پست طبقوں میں والدین

اپنی اولاد پر قابو نہیں رہا۔ لڑکی اگر رات میں دیر سے گھر واپس آتی ہے تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس بے راہ روی سے جو معاشری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اس سے سوسائٹی کو گھن لگ گیا ہے۔ انگلستان میں عام طور پر ادنیٰ طبقہ اور مزدوروں کی خانگی زندگی اور اخلاقی حالت پست ہے۔ ملازم پیشہ لوگوں میں بالعموم عورتیں کماتی ہیں اور مرد کھاتے ہیں۔

مغربی عورتوں کی ان حیا سوزیوں کے باوجود ان کے عیوب پس پردہ ہیں اور ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خانگی زندگی خواہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو لیکن پبلک زندگی میں یورپ کے ہر شخص کے ہاتھ سے قومی خصوصیات کا دامن نہیں چھوٹتا۔ وطن پروری، ضبط و نظم اور ہمدردی میں یہ لوگ آپس میں یکساں نظر آتے ہیں۔ اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

مذہبی رجحانات | اہل یورپ کے مذہبی رجحانات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ یورپ کا کوئی مذہب نہیں۔ انگلستان میں پرائسٹنسزم سرکاری طور پر ملک کا مذہب تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ برائے نام ہے۔ عوام کا دراصل کوئی مذہب نہیں۔ اگر ایک طرف دنیا کی مادی ترقیوں نے مذہب کو دیوالیہ کر دیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کی کاروباری مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کو خدا کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ علوم و فنون کی غیر معمولی اشاعت سے ہر چیز عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے وہاں کوئی شخص حضرت ابن مریم کو خدا کا بنیا ماننے تیار نہیں ہے۔

مذہبی نقطہ نظر سے اہل یورپ میں جو اچھائیاں نظر آتی ہیں وہ براہ راست

مذہبی اثرات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہاں ہر چیز کے افادی پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔ جھوٹ نہ بولنے کی وجہ اللہ اور رسول کا ڈر نہیں ہے بلکہ وہ برے نتائج ہیں جو عملاً جھوٹ بولنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔ مادہ پرست ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ہر شے کو مادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنی قوم کی بقاء کے لئے اسے دنیا میں کچھ کرنا ہے چنانچہ ایک معمولی سڑک جھاڑنے والے میں بھی اتنا قومی احساس ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو بحیثیت مجموعی قومی مفاد کے منافی ہے۔

یورپ میں خدا کے بعد یا اس کے برابر اگر کسی کا درجہ ہے تو وہ روپیہ ہے۔ اور وہاں کا ہر تنفس اس قاضی الحاحات کا سچا اور حقیقی پرستار ہے۔

ذاتی خصوصیات | جہاں تک مختلف یورپی اقوام کی خصوصیات، ذاتی کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریز

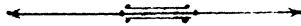
سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ فرانسیسی جتنے جلد دوست بنتے ہیں اتنے ہی جلد بھول بھی جاتے ہیں۔ انگریز بہت مشکل سے دوست بنتے ہیں لیکن دوستی کے بعد آخر دم تک اُسے نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح ایک انگریز خود فضول خیر نہیں ہوتا وہ اپنے کسی دوست کو بھی فضول خرچ نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح دوستی میں انگریز مشہور ہیں اسی طرح ان کی دشمنی بھی سخت ہوتی ہے لیکن وہ کینہ پرور نہیں ہوتے۔ کسی چیز کو معاف کر دیں گے لیکن اُسے بھولیگے نہیں۔

عہد حاضر کی جملہ ترقیوں کے باوجود یورپ ابھی اس درجہ کمال کو نہیں پہنچا **خاتمہ** جہاں مسلمان اپنے عروج کے زمانہ میں پہنچے تھے اور نہ اس کا کوئی امکان ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تنظیم، عزم و استقلال، رواداری، سہرے بازی، خود داری اور دیگر خصوصیتوں سے دنیا ہمیشہ درس بصیرت حاصل کرتی رہیگی۔



الحمد للہ

ڈاکٹر سید حسین



ڈاکٹر سید حسین تمدن دنیا میں بحیثیت جرنلسٹ، مقرر و سیاست دان
 بے حد مشہور و مقبول ہیں۔ آپ ہندوستان میں اخبار ”انڈیپنڈنٹ“
 اور امریکہ میں ”نیو اورینٹ میگزین“ کے ایڈیٹر تھے۔ ڈاکٹر سید حسین ہندوستانی
 وفد کے اُن تین ارکان میں سے ایک ہیں جو صلحنامہ سیورس کے تحت
 ترکی سے متعلق ہندوستانی زاویہ نظر کو پیش کرنے پر یورپ روانہ کیا گیا تھا۔
 ڈاکٹر سید حسین نے ہندوستانی صحافت کی نمائندگی بھی کی ہے۔
 گذشتہ سترہ اٹھارہ سال سے آپ امریکہ میں متوطن اور وہاں
 کی جنوبی کیلفورنیا کی جامعہ میں اسلامی تاریخ و تمدن ہند کے لکچرار ہیں امریکہ
 میں آپ کی حیثیت ہندوستان کے ایک غیر سرکاری سفیر کی ہے اور ”ماور ہند“
 جیسی کتابوں کے مبالغہ آمیز پروگنڈے کے ازالہ میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔
 ڈاکٹر سید حسین گذشتہ سال ایک تقریری سفر کے سلسلے میں ہندوستان
 تشریف لائے تھے اور جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام حیدر آباد میں بھی آپ کی
 توسیعی تعاریر ہوئی ہیں۔

اختلافات | دنیا میں ہندوستان اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرح کوئی دو ملک ایسے نہیں ہیں جن میں اتنے نمایاں اختلافات پائے جاتے ہوں جتنے ہندوستان و دنیا کی قدیم ترین تہذیب و تمدن کا وارث ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ دنیا کا نوخیز ترین ملک ہے۔ زندگی کے متعلق ہندوستانیوں کا نقطہ نظر ایک وسیع بانغ نظری پر مبنی ہے اور ممالک متحدہ امریکہ کا نقطہ نظر ایک جوشیلے نوجوان کا نقطہ نظر ہے۔ ہندوستان میں پیرم سلطان بود کی ذہنیت عام طور پر موجود ہے لیکن خوش قسمتی سے امریکہ کا کوئی ماضی ہی نہیں ہے۔ ان کے گرد و پیش ایک زندہ حال ہے۔ اہل امریکہ خود مختار آزاد اور قوم پرور ہیں۔ ہندوستانیوں کی زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ پیدائش ہی سے امریکہ کا ہر بچہ ملک، قوم اور قومی پرچم پر فخر کرنا سیکھتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے ماضی قریب میں ایسی کوئی قوم پرورانه بات نظر نہیں آتی۔ امریکی طریقہ تعلیم ایسے اصولوں پر مبنی ہے کہ اس سے تذکرہ بالا چیزوں کے حصول میں مدد ملتی ہے اور ہندوستان میں برطانوی طریقہ تعلیم کی ہو بہو نقل اتارنے سے کوئی سودمند نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ہر امریکی تعلیمی ادارہ میں روزانہ ممالک متحدہ امریکہ کے پرچم کو سلامی دی جاتی ہے لیکن اسے نصیب ہندوستان کا کوئی قومی پرچم ہی نہیں جس کو قانون ملک یا اقوام عالم تسلیم کریں۔ ہندوستانی نوجوان اپنے ملک سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کیونکہ اس کے معنی سنزائیں جگمگتا اور تکلیفیں اٹھانا۔

جامعیتیں اور اختلافات | اہل امریکہ میں اپنی جامعیتیں بھی ہیں اور ان کے آپس کے اختلافات بھی ہیں لیکن یہ ساری چیزیں خوشگوار قسم کی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بات نہیں ہے۔ یہاں اختلافات

اس قسم کے ہیں کہ ان سے کوئی ٹھوس اور بنیادی کام انجام نہیں پاسکتا۔
 مالک متحدہ امریکہ کی ڈیڑھ سو سال کی تاریخ نے جمہوریت کی تعمیر کے سلسلے میں
 مختلف قوموں کو ایک خاص رشتہ اتحاد میں منسلک کر دیا ہے۔ گواہی دے دیں انگریز،
 فرانسیسی، ہسپانوی کی تفریقیں تھیں لیکن آجکل ہر شخص حقیقی معنوں میں امریکی ہے اور
 ان میں کسی قسم کے نسلی امتیازات باقی نہیں رہے۔ اس طرح مالک متحدہ امریکہ
 ہندوستانیوں کے لئے ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ امریکہ میں بیسویں صدی بھی فرستے ہیں اور
 ہر ایک کو کمال آزادی حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں مذہبی اعتقادات کو فرقہ واری
 مناقشات کی بنیاد کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس پر ڈاکٹر سید حسین نے تعجب کا اظہار
 کرتے ہوئے فرمایا کہ بحیثیت استاد آپ نے ہزاروں امریکی لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھا
 ہے جو آپ کی جامعہ میں سے تعلیم پا کر نکلتے رہے ہیں لیکن آپ نے ایک بھی
 مثال ایسی نہیں دیکھی کہ کسی خاص مذہب کے پیرو ہونے کی وجہ سے کسی کے ساتھ
 حقارت آمیز سلوک کیا گیا ہو۔ ہندوستان میں جس قسم کا مذہبی تعصب ہے وہ امریکہ
 میں ناپید ہے۔ یہاں لوگ کتے اور بلیوں کی طرح لڑتے ہیں۔

معاشری نفعیت مالک متحدہ امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ادسط بہت زیادہ ہے۔
 ۹۹ فیصد امریکی تعلیم یافتہ ہیں۔ بچوں کے مدرسہ بھیجنے کے لئے
 ایک قانون نافذ کیا گیا ہے جس کے بموجب والدین بچوں کو مدرسہ بھیجنے کے لئے
 مجبور ہیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں انھیں عدالت کے روبرو
 پیش کیا جاتا ہے اور اگر طینان بخش توجیہ نہ پیش کی جائے تو انھیں جیل خانہ جانا
 پڑتا ہے۔ امریکہ کے تعلیم یافتوں کی تعداد کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ وہاں بچے

لکھے لوگوں کی یقینی تعداد ہے اتنی ہی ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی ہے۔ ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ وہ یہ سن کر خوش ہو گئے اگر انگریز ہندوستان میں بچوں کو درس نہ بھیجنے کی علت میں ان کے والدین کو جیل بھیجا کریں۔ لیکن یہاں پر تو جیلخانے ہزاروں کی تعداد میں کسی اور قسم کے جرم کی پاداش میں بھرے جاتے ہیں۔

مالک متحدہ امریکہ میں ہر فرد کو مساوی موقعے حاصل ہیں۔ وہاں والدین کی دلی تمنا رہتی ہے کہ ان کا بچہ مالک متحدہ کا صدر بنے اور اس مقصد کے حصول میں کوئی مشکلات بھی نہیں ہیں۔ قانون کی نظر میں سب ایک ہیں۔ مساوات کا یہ عالم ہے کہ وہاں ایک جماعت کو دوسری جماعت پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ حکومت کی جانب سے کسی شخص کو کوئی خطاب یا اعزاز عطا نہیں کیا جاتا اور نہ اہل امریکہ کو غیر ملکی خطاب یا اعزازات قبول کرنے کی اجازت ہے کیونکہ اس سے لوگوں میں چھوٹے بڑے کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ لوگ اگر صدر جمہوریہ کا بھی نام لیتے ہیں تو محض روز ولٹ یا سٹرن روز ولٹ کہتے ہیں۔ غرض امریکہ دنیا کے تمام مالک حتیٰ کہ برطانیہ غلطی سے بھی سیاسی، سماجی، معاشی و اقتصادی معاملات میں پچاس سال آگے ہے۔

امریکہ میں آقا اور ملازم کے تعلقات ہم سے بہت مختلف ہیں۔ آقا اپنے ملازم کے ساتھ کبھی غیر شائستہ الفاظ استعمال نہیں کرے گا اور نہ ہی ملازم ان کو برداشت کر سکتا ہے۔ وہاں کی معاشری نفسیات بالکل مختلف ہے۔ وہ آزاد مرد اور عورتوں کی قوم ہے۔ حتیٰ کہ انگریزوں کی معاشری نفسیات بھی امریکہ کے مقابلہ میں ایک صدی پیچھے ہے۔

دوسری اقوام کی طرح امریکی لڑکے اور لڑکیوں کا کوئی ماضی نہیں ہے۔ انکو

حال سے واسطہ ہے معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے میں وہ لوگ اتنے مصروف ہیں کہ انھیں ماضی کی الجھنوں میں پھنسنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ تو صرف ہندو ہے جہاں ماضی پر تکیہ کیا جاتا ہے اور لوگوں کو معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

عورت ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ عام طور پر امریکہ کی عورتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ حد سے بہت آگے نکل گئی ہیں اور ان کی اخلاقی حالت گری ہوئی ہے۔ یہ خلاف واقعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں اس قسم کی عورتیں ضرور موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکی نسوانیت نے تہذیب کا ایک ایسا اعلیٰ معیار حاصل کیا ہے کہ کوئی دوسرا ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ امریکی عورت کو وہی مواقع حاصل ہیں جو مردوں کو ہیں۔ ان کے اپنے انفرادی مشاغل حیات ہیں۔ جامعات میں عورتوں کے لئے زندگی کے مختلف پیشوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ امریکہ کا طریقہ تسلیم ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کا مقصد ہی یکساں طور پر تمام عورتوں کی حالت سدھارنا ہے تاکہ وہ اپنی روٹی آپ کما سکیں۔ ہندوستان یا دوسرے ممالک میں اکثر صورتوں میں شادی عورت کے لئے اس کی روٹی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چونکہ امریکہ میں مرد اور عورت ایک سطح پر ہیں وہاں کی عورت روٹی سے شادی نہیں کرتی بلکہ مرد سے شادی کرتی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک کے مقابلہ میں امریکہ میں ہزاروں ایسی عورتیں ہیں جو اپنا پیٹ آپ پالتی ہیں۔ وہاں کے طریقہ تعلیم سے انھیں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہاں ہم تعلیمی کا طریقہ رائج ہے جس میں کسی قسم کی بداعتدالیاں پیدا ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ اور یہ پیدا ہوں تو کیوں ہوں؟

بدقسمتی سے ہمارے پاس اور بہت سی اہم چیزوں کو چھوڑ کر جنس کو مضحکہ خیز اہمیت دیدی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں جنسی خیالات غیر متوازن اور ناسازگار ہیں۔ برٹرنینڈرسل نے جس کے پیش نظر خاص ہندوستان کی مثال تھی شوہر اور بیوی کے تعلقات کو پولس اور چور کے تعلقات سے تشبیہ دی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں غاروں میں رہنے والے ابتدائی انسانوں کی ذہنیت پائی جاتی ہے۔

نسلی تعصب | امریکہ میں رنگ اور نسل کا مسئلہ پہلے کی طرح شدید نہیں رہا ہے دو ایک جنوبی ریاستوں میں ایک حد تک یہ چیز پائی جاتی تھی لیکن آجکل تو بعض وفاقی عہدوں پر بھی جیشی مامور ہیں اور آئندہ ربع صدی میں امریکہ میں جیشی مسئلہ کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔

امتناع مسکرات | امریکہ میں امتناع مسکرات میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ آبادی کا بڑا حصہ شراب نوشی کی تائید میں تھا۔ امتناع کا قانون بھی دراصل ایک قلیل جماعت کی وجہ سے منظور و نافذ ہوا تھا جو جنگ کے بعد بڑی طاقتور گھوٹی تھی۔ نفاذ قانون کے وقت بھی کثرت رائے سے نوشی کی حامی تھی۔ مگر اس قانون کی تیغ کے بعد لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ملکی قوانین | امریکہ میں توطن پذیری کے خلاف اس لئے قوانین نافذ کئے گئے ہیں الاقوامیت کہ امریکی اپنے معیار زندگی اور معاشری مرتبت کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

اس سوال پر کہ بین الاقوامیت کے متعلق امریکہ کا کیا طرز عمل ہے ڈاکٹر حسین نے

فرمایا کہ جنگ اور جنگ کے بعد کے زمانہ میں امریکی نقطہ نظر بین الاقوامی تھا۔ پرنسٹن ولسن ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مجلس اقوام کی داغ بیل ڈالی لیکن اس کے بعد امریکہ نے ادھر توجہ نہیں کی کیونکہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جنگ میں شریک ہو کر اس نے غلطی کی۔ ثانیاً یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جنگ کے بعد اکثر بڑی طاقتوں نے ممالک متحدہ کے قرضہ جنگ کی ادائیگی کی جانب توجہ نہیں کی بلکہ گزشتہ چند سال میں اس قرض کا سود تک ادا نہیں کیا۔ لہذا اب امریکہ کسی بیرونی طاقت کا ساتھ دینے آمادہ نہیں ہے اور نہ وہ کسی بیرونی جنگ میں حصہ لیگا۔ البتہ اگر اس پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ مدافعت ضرور کریگا۔

ہندوستان کی تاریخی عظمت | ڈاکٹر سید حسین نے ہندوستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے

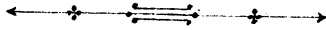
فرمایا کہ اگر ہندوستان اپنی گزشتہ عظمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے محض سیاسی آزادی ہی حاصل کرنا کافی نہیں ہے۔ سیاسی آزادی تو بہر صورت حاصل ہو جائے گی اور ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن ہندوستانی مرد اور عورتوں کو سب سے پہلے حقیقی ہندوستان کی از سر نو تلاش کرنی چاہیئے۔ اس ہندوستان کی جن نے دنیا میں مذہب فلسفہ اور تہذیب میں مشعل ہدایت روشن کی تھی۔ اگر ہندوستان میں ذرا بھی روشن دماغی ہے تو انہیں سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہندوستانی جو کسی زمانہ میں عروج کے انتہائی نقطہ پر تھے آج انتہائی پستی کی حالت میں ہیں۔ اس کے بعد انہیں فکر کرنا چاہیئے کہ گزشتہ عظمت کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے تمدن کے ارتقاء میں تسلسل جاری ہے اور خیالات اور تہذیب میں باہمی تبادلہ ہوتا رہا ہے۔ مورخین نے یونان کو دنیا کا سب سے قدیم تمدن بتلایا ہے۔ لیکن اب یہ مسلمہ ہے کہ یونانیوں نے بھی مصری اور ایرانی تمدن سے اکتساب کیا تھا۔ رومہ کی عالمی شہنشاہیت یونانی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ موجودہ مغربی تمدن اور رومہ کے تمدن کی شکست کے درمیان پورے ایک ہزار سال کی خلیج واقع ہے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ اسلامی تمدن کے زیر اثر تھا۔ لیکن ان سب تمدنوں میں ہندوستان کے تمدن کو سب پر اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ سب سے قدیم ہے اور یہ دنیا کی تاریخ کی ایک حیرت ناک حقیقت ہے کہ وہ اتنی کمزور ہے اور اس میں آئندہ بھی زندہ رہنے کی طاقت ہے۔ یوں تو دنیا میں مصری، ہینز نطانی، یونانی، رومی اور کاریج کے تمدن آئے اور فنا ہو گئے لیکن صرف ایک ہندوستانی تمدن ایسا ہے جو فنا کی گود میں پرورش پا کر بھی زندہ ہے اور ابھی تک اس کا سماجی، روحانی اور تہذیبی اثر باقی ہے۔ ہندوستانی تمدن کے متعلق لارڈ کرزن نے کہا تھا کہ نوع انسان کی تاریخ، مذہب اور فلسفہ پر دنیا کے دوسرے تمدنوں کے مقابلہ میں ہندوستان نے سب سے زیادہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں اب ہندوستانی طلباء کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ کیوں ہندوستان جو کسی زمانہ میں نور اور ہدایت کا سرچشمہ اور روحانی عظمت کا مسکن تھا آج افلاقی پستی کے آخری درجہ پر ہے۔ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ایک شمع تکتی نہیں ہے کہ وہ جدید تمدنوں کو روشنی بتلا سکیں۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے ؟

اس کے لئے طلباء کو سائنٹفک طریقوں سے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ تنزل کیوں واقع ہوا اور عظمت ماضی کے حصول کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ سوال یہ ہونا چاہیئے کہ آہندہ وستانی کیا کر رہے ہیں نہ یہ کہ ان کے اسلاف نے کیا کیا۔ اسلاف نے تو دنیا کو اپنا سب کچھ دیدیا — مذہب، روحانیت اور فلسفہ جس پر ہندوستان کو آج بھی ناز ہے۔



مولوی سجاد مرزا صاحب



مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کنٹ) عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل اور ملک کے مشہور تعلیمی رسالہ ”المعلم“ کے مدیر ہیں۔ آپ کا تعلیمی تجربہ بہت وسیع ہے اور آپ نے اردو میں کئی تدبیری کتب کا اضافہ فرمایا ہے۔ آپ کا ”اردو کا قاعدہ“ اردو کا بہترین قاعدہ سمجھا جاتا ہے جس میں بچوں کی فطرت ان کے ذوق اور میلان طبع کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۳۷ء سے رہا۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں جاپان کی اور ۱۹۳۹ء میں یورپ و ترکی کی سیاحت بھی فرمائی ہے۔

تعلیمی حالات | حصول علم کے لئے جو لوگ ہندوستان سے انگلستان جاتے ہیں انہیں سب سے زیادہ اس امر پر تعجب ہوتا ہے کہ وہاں کی بڑی بڑی جامعات اور مدارس کی حیثیت خانگی ہے اور ان کے نظم و نسق اور اخراجا کو مرکزی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ان کے بیاہ و سفید کے مالک ایسے اشخاص ہوتے ہیں جنہیں حکومت یا اس کی ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور

حکومتی مداخلت کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے دوران میں جن افسورڈ اور کیمبرج کے اخراجات کی تیق کے لئے مرکزی حکومت نے کوشش کی تو اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ حقیقت میں قابل مبارکباد ہے وہ قوم جس نے حکومتی امداد کے بغیر برسوں سے اپنے فہناؤں کی تعلیم کا اتنا بہتر اور اعلیٰ انتظام کیا ہے اور ان تعلیمی اداروں کے دروازے بلا تفریق مذہب و ملت دنیا کے ہر فرد کیلئے کھول دیئے ہیں۔

یورپ کی اقوام نے عرصہ دراز سے انسان کی مساوات کے اصول کو تسلیم کیا ہے اور وہاں ہر شخص کو ہر معاملہ میں یکساں موقع حاصل ہیں۔ اصول مساوات میں تقویت کے ساتھ ساتھ بچہ کی اہمیت بھی بڑھ گئی اور ایک ایسا دور آگیا جب بچہ کی تعلیم و تربیت والدین کے ہاتھوں سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آگئی۔ پانچ برس کی عمر سے تعلیم جبری اور مفت کر دی گئی۔

یورپ کے کسی ملک میں بچوں کو نہ صرف کتابیں، کاپیاں، پنسل اور ہتی مشاغل کے سامان مفت حکومت کی جانب سے دیئے جاتے ہیں بلکہ ان کا علاج معالجہ بھی مفت کرایا جاتا ہے۔ اوقات مدرسہ میں انھیں موزون غذا اٹھلائی جاتی ہے جو نہ صرف صحت مند اور ارزان ہوتی ہے بلکہ والدین چاہیں بھی تو ایسا انتظام نہیں کر سکتے۔ ہر بچہ کو دن میں ایک مرتبہ پلو یا دودھ پلایا جاتا ہے۔ لندن میں دودھ اتنا سستا ہے کہ اس کی قیمت فی سیر ایک پتی یا دو آدھ ہے۔ یہ سب کچھ ایسے مادہ پرست ملک میں ہے جہاں گائے کی یتش تو نہیں بلکہ اُس کی پرورش دودھ کی خاطر کی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موثر تعلیمی نتائج کے لئے متذکرہ سہولتوں کے علاوہ
 موزوں عبارت، بازیگاہ، مناسب اور کافی فرنیچر اور آلات تعلیمی کا ہونا ضروری ہے
 اور ان چیزوں کی طرف یورپ میں خاص توجہ صرف کی جاتی ہے۔ لیکن مولوی سجاد
 مرزا صاحب نے بعض ایسے بھی مدارس دیکھے ہیں جو جاری طرح مشکلات میں گھرے
 ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان حالات پر تابو حاصل کیا گیا تھا کیونکہ جب اصول
 پر پورا پورا اعتماد ہو تو ان کی تکمیل کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیا جاسکتا ہے۔
 فعلیت سے تجربہ اور تجربہ سے علم حاصل ہوتا ہے اور علم کے بعد غور و فکر کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔
عورت کی زندگی انگلستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی دوسری چیز جو ماؤں
 نظر ہے وہ عورتوں کو آزادانہ پلٹے پھرتے کام کاج کرتے اور
 ہر صحبت میں شریک ہوتے دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے پہلے عورتوں
 نے مردوں کے مساوی حقوق تو حاصل کر لئے تھے لیکن یہ خیال عام تھا کہ عورتیں
 پھر بھی صنعت نازک سے تعلق رکھتی ہیں اسلئے مردوں کو انکا پاس و لحاظ کرنا چاہیئے محنت
 طلب اور جو کھم کے کام مرد ہی کو انجام دینے چاہیں۔ لیکن جب گولی بارود کے بے ڈھنگ
 استعمال سے ہزاروں نوجوانوں کی جانیں ضائع ہونے لگیں تو جنگ کے جاری رکھنے
 کے لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے پیشے جو صرف مردوں کے لئے مخصوص تھے
 ان میں عورتوں کی بھرتی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جب رہے رہے اوصاف عمر کے مرد بھی
 میدان جنگ روانہ ہونے لگے تو ان کی جگہ عورتوں کو یعنی ٹری۔ سرکاری محکموں
 میں عورتیں بھر گئیں، عورتیں موٹر ران ہو گئیں، پولس میں داخل ہو گئیں اور سوائے
 میدان جنگ میں لڑائی لڑنے کے دوسرے ہر قسم کے فوجی کام کرنے لگیں

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معاشری حیثیت سے بھی عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہو گئے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ اگر بھولے بسرے کوئی مرد ان کے صنف کے خیال سے پاس دلچاظ کرتا ہے تو وہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اپنے لئے اس قسم کا برتاؤ باعث ذلت تصور کرتی ہیں۔

عورت کا سماجی اور سیاسی حیثیت سے مرد کے مساوی اور ہم پلہ ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے اخلاق کس قسم کے ہونگے؟ شرم و حیا، جو عورت کا حقیقی زیور ہے اس کی کیا نوعیت ہوگی؟ ازدواجی تعلقات نے کیا صورت اختیار کی ہوگی؟ اکثر لوگوں کو یہ سن کر غالباً تعجب ہوگا کہ انگلستان میں دوسرے ممالک کی طرح کوئی عورت اپنے حسن و جمال کو ذریعہ آمدنی نہیں بنا سکتی انگلستان کا قانون اس قسم کے ”پیشہ“ کو قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہاں عورت عورتوں کے لئے بلکہ مردوں کے لئے بھی اخلاق کا معیار بنتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی کشمکش ہر جگہ بالخصوص عورت کی اخلاقی خرابی کا باعث ثابت ہوئی ہے اور مصلحان مغرب نے جب اس نکتہ کو سمجھا تو انہوں نے معاشی حالت کی درستی کو مضبوط ترین ذریعہ اصلاح اور استحکام اخلاق گردانا۔ بادی النظر میں یہ خیال ہوتا ہے کہ عورت کی آزادی مخرب اخلاق ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو خود آزادی بڑی ذمہ داریاں عاید کرتی ہے اور انگلستان کی عورت جتنی آزاد ہے اتنی ہی وہ اپنی عفت و عصمت کی زبردست پاسان بھی ہے۔ جنگ عظیم میں جس طرح یورپ کی قوموں نے اپنا خون بہایا عورتوں نے سخت ترین مصائب جھیلے اور زبردست مشکلات کا مقابلہ کیا اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ ان کے اخلاق کا معیار کتنا بلند ہے جس سے ہر شخص سبق حاصل کر سکتا ہے
حریت و مساوات کی بدولت ازدواجی زندگی بھی خوشگوار ہوتی ہے کیونکہ
ایسے ہی لوگ شریک زندگی بنتے ہیں جو ایک دوسرے سے واقف اور اپنے اخراجات
کے کفیل ہوتے ہیں۔ دونوں اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتے ہیں اور اپنی اولاد کو اپنے
سے زیادہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ نسلاً بعد نسل، متول،
تہذیب اور شائستگی میں ترقی کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔

ہمارے ملک میں عام طور پر یورپ کی حریت پسند عورتوں کے متعلق بڑی
غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کی فضا ایسی ہے کہ یورپ کی عورتوں کے
بجائے اگر ترکی یا عراق کی عورتوں کے حالات کا تذکرہ کیا جائے تو شاید یہ چیز اہل ملک
کے جمود میں کچھ حرکت کا باعث ثابت ہو۔ کسی اسلامی ملک کا کونہ کونہ چھاننے پر
بھی وہ ”پردہ“ نظر نہیں آئیگا جو ہندوستان میں عورتوں کی زندگی کا جزو اعظم بنا دیا
گیا ہے۔ ترکی میں حرم سرا کی زندگی نے عورتوں کے عادلانہ و اخلاق خراب کردہ
تھے، ان کے قومی کمزور ہو گئے تھے، ان میں مختلف امراض مثلاً تپ دق
رسل پیدا ہو گئے تھے، ان میں ذہنی انحطاط پیدا ہو گیا تھا اور خود داری مفقود
ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عورت کا ذریعہ معاش صرف
ایک ہی ہے یعنی اپنی صنف کا استعمال۔ ظاہر ہے ان حالات اور ایسے تاریک
ماحول میں کس قسم کے بچے پیدا ہوں گے اور ان کی نشوونما کا نازک زمانہ کس
فضا میں بسر ہو گا یہی وہ اسباب ہیں کہ ترکی کے مہمان قوم نے حرم سرا کی مصنوعی
زندگی کو ایک لخت مسمار کر دیا اور ترک عورت کو صدیوں کی غلامی و بیچارگی سے

نجات دلائی۔

ہندوستان کے یاس انگیز حالات کے متعلق مولوی سجاد مرزا صاحب
کے دماغ میں جو سوالات پیدا ہوئے وہ یہ ہیں کہ کیا نحیف مریض اور غمگین عورت
کا بچہ تنومند، صحت و راوی خوش مزاج ہو سکتا؟ کیا تنگ خیال عورت کا بچہ
روشن خیال اور کیا مقید عورت کا بچہ آزاد ہو سکتا ہے؟



مولوی قادر حسین خان صنا

مولوی قادر حسین خاں صاحب ایم اے بیرسٹریٹ لانا نظام کالج کے پرنسپل اور جامعہ مدراس کے سینٹ، اکاڈمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے رکن ہیں۔ آپ سررشتہ معلومات عامہ سرکاری کے سلسلہ تا سلسلہ ناظم رہ چکے ہیں۔ معاشیات و نظم عامہ آپ کے خاص مضامین ہیں جن پر آپ نے جامعہ آکسفورڈ، لندن اور پیرس میں تحقیقات بھی فرمائی ہیں۔ انگلستان میں آپ کا قیام سلسلہ تا سلسلہ رہا۔

یورپ کی تقلید | یورپین اقوام کی زندگی کی تقلید کرنے کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یورپ نے بہت سی چیزیں ہم سے سیکھی ہیں۔ ہم ان چیزوں کو بھلا بیٹھے ہیں اور ہم پر ادوار کی گھٹا چھائی ہے۔ یورپ ان پر عمل پیرا ہے اور بام ترقی پر ہے۔

قرون وسطیٰ تک یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس ظلمت میں مسلمانوں نے شمع ہدایت روشن کی اور اپنے زندہ جاوید کارناموں سے یورپ کے

تن مُردہ میں بیداری کی روح پھونکی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان اپنی ترقی کے اُمج پر تھے جہاں آج بھی یورپ اخلاقی نقطہ نظر سے باوجود اتنی تہذیب و تمدن کے اس معیار کو نہیں پہنچا ہے۔

نظر غائر سے دیکھنے والوں کو اسلامی اور یورپین تہذیب میں ایک بڑا فرق محسوس ہوگا۔ وہ یہ کہ آخر الذکر کی بنیاد عیسائیت پر قائم ہے۔ ایسی عیسائیت پر جس کے خدا کے تصور کو عقل انسانی تسلیم نہیں کر سکتی۔ جہاں انسانی اعمال کی کوئی حقیقت نہیں اور جہاں گناہ کا تصور انسانی کفارہ پر رکھا گیا ہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جس سے ہم درس بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کی بنیادیں ایسی کھوکھلی نہیں ہیں۔ یہاں ہر چیز فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کی ترقی نتیجہ ہے صدیوں کی مسلسل سعی و کوشش کا۔ مسلمانوں نے صرف تین سو سال کے قلیل عرصہ میں اتنی ترقی کی تھی کہ یورپ ابھی صدیوں تک یہ بات پیدا نہیں کر سکتا۔

اسلامی اصول | آج بھی اسلامی اصول یورپ کے لئے سرمایہ بصیرت ہیں۔ یورپ میں گداگری قانوناً ممنوع ہے لیکن افلاس زدہ لوگوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔ کیا ہماری زکوٰۃ کے بعد معاشرہ کا ایک بھی شخص محتاج رہ سکتا ہے؟ یورپ میں قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے لیکن برا اخلاقی عام ہے۔ عورتوں کی بے راہ روی اور جیاسوز آزادی، ناجائز اولاد کی کثرت اور طلاق کی زیادتی اس قانون کے ٹل ہونے کے نتائج ہیں۔ اسلام نے خاص حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے اور اس قانون کی مصلحت اور عمدگی کا اندازہ یورپ کے حالات دیکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح شراب خواری

اور جو بے بازی کی کثرت کی وجہ سے یورپین سوسائٹی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جو فوری اصلاح کی محتاج ہیں۔ اسلامی قانون وراثت یورپ کے قوانین وراثت سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔ یہ نہیں کہ انگلستان کی طرح صرف فرزند اکبر ہی ساری جائیداد کا مالک بن بیٹھا اور دوسرے ہوا پر اڑ گئے۔ اسلام میں ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ دولت کی تقسیم اور سیال پذیر می جتنی اسلام میں ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت کے بہترین اصول اسلام میں موجود ہیں۔ یورپ کی معاشی ترقی کی بنیاد سود خواری پر ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں ایک ایسے مفت خور طبقہ کا اضافہ ہو گیا ہے جو اپنا بیکار پیسہ کفالتوں اور دیگر سودی کاروبار میں لگا کر محض دولت بٹور رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں سرمایہ اور محنت میں سخت کشمکش جاری ہے جس سے پوری سوسائٹی متاثر ہے۔ ان دونوں طبقوں میں جو خلیج حائل ہے اس کو عبور کرنے کے لئے آئے دن تجاویز پیش ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کیونکہ جب تک ملک میں ایک طبقہ الدار اور اس کے مقابلہ میں دوسرا مفلس موجود ہے تو دونوں میں آویزش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی اصول اور قوانین ایسے ہیں کہ ان سے افراد میں معاشی کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کشمکش کی جو بنیاد ہے یعنی سود اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح منافع کمانے کے لئے بھی اسلام نے طریقے بتلائے ہیں۔ تحط سالی کے زمانہ میں اجناس کا جمع کر لینا تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے ہمارے پاس جائزہ نہیں ہے۔

خاتمہ یورپ کی ترقی اگر محنت اور تنظیم کا نتیجہ ہے تو کیا اسلام نے محنت کی

ملقین نہیں کی ہے اور کیا مسلمانوں میں تنظیم نہیں تھی۔ ان کی تنظیم اور ضبط ہی نے انہیں ایک قلیل مدت میں دنیا کے فاتحین کی صف اول میں لاکھڑا کر دیا تھا۔ یورپ میں کوئی شخص محنت سے جی نہیں چراتا اور کوئی پیشہ اس کی لٹروں میں ذلیل نہیں ہے۔ لیکن ہمارے لئے سرکاری ملازمت معراج ہے۔ ہم نے محنت کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ ہم نے ساری چیزیں قسمت پر چھوڑ دی ہیں جس کا خمیازہ بھی ہم بھگت رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ یورپ کی کونسی ایسی چیز ہے جو ہم میں موجود نہیں ہے یا جو ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ صرف جوش، خلوص اور سلیقہ کی ضرورت ہے۔ کیا آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ میں ہمیں وہ سب حاصل نہیں ہو جاتا جس سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

پروفیسر حسین علی مرزا

پروفیسر حسین علی مرزا بیرسٹراٹ لاجامعہ عثمانیہ کے شعبہ قانون کے مد ہیں۔ آپ کو اصول تعلیم سے بچہ دلچسپی ہے اور انگلستان کے حالات کا آپ نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ قانون بین الاقوام اور تاریخ دستوری آپ کے خاص مضامین ہیں۔ "وفاق اور حکومت ہند" پر آپ نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے جو زیر طبع ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ستمبر تا دسمبر ۱۹۲۵ء رہا۔

انگلستان میں اعلیٰ تعلیمی ادارات زیادہ تر خانگی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ زمانہ تعلیم قدیم میں جامعیت اور کالجوں کا قیام مذہبی اوقات کے ذریعہ ہوتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنا اس طرح ہوئی۔ لیکن انگلستان میں ابتدائی جبری تعلیم کا آغاز ۱۸۷۰ء کے بعد سے ہوا جبکہ جرمنی میں سماجی قانون سازی کی تحریک زور و دل پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود انگلستان میں تعلیم کی توسیع و اشاعت کا یہ عالم ہے کہ اپنے چار سال کے قیام میں پروفیسر حسین علی مرزا کو انگلستان میں

ایک شخص ایسا ملا جو ان پڑھ تھا اور جس کی وجہ اس نے اپنا مفلوج ہونا بیان کیا۔ انگلستان میں پبلک اسکول کا طریقہ بھی بہت ہی قدامت سے چلا آ رہا ہے لیکن ان جلد قدیم ادارات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تعلیم ایک خاص اصول اور نصاب کے تحت دی جاتی ہے جو بیسویں صدی کی علمی زندگی کی ضروریات کیلئے ناکافی ہے اور اس کی کوئی جماعت اور ادارات کے قیام کے ذریعہ پورا کیا جا رہا ہے چنانچہ لندن میں برناؤ شا، سنڈنی وب اور گراہم والس کی کوششوں سے ایک مدرسہ معاشیات قائم کیا گیا جہاں نہ صرف اجرت تعلیم ہی کم رکھی گئی ہے بلکہ پڑھائی کے اوقات بھی صبح و شام ایسے رکھے گئے ہیں کہ ہر شخص اپنی سہولت اور فرصت کے لحاظ سے استفادہ کر سکتا ہے۔ آج اس مدرسہ معاشیات نے ایک بین الاقوامی اہمیت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبہ علم کی ڈگری جو بہت ہی مستند تسلیم کی جاتی ہے یہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یورپ کے جملہ ممالک کے طلباء یہاں جمع ہوتے ہیں اور یہاں کے اساتذہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں جیسے گراہم والس آبنجانی، ملی سمٹھ ایم پی، پروفیسر لاسکی، ڈاکٹر گرگری، ڈاکٹر ولف وغیرہ۔

اس ادارے کی طرح لندن میں ایک اور ادارہ حرفت (political Science)

جہاں پر ہر قسم کی پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام ہے اور درس کے اوقات بھی صبح و شام کے ہیں۔

تعلیم یافتہ بیروزگاری | میرے اس سوال پر کہ ملک میں تعلیم اتنی عام ہونے کے باوجود وہاں تعلیم یافتہ بے روزگاری کا سوال کیوں نہیں پیدا ہوتا آپ نے فرمایا کہ اپنے چار سال کے قیام میں آپ کو ایک بھی ٹیلیفانی

ایسا نہیں ملا جو بے روزگار ہو۔ البتہ جسمانی محنت کرنے والوں میں بے روزگاری سخت سے پائی جاتی ہے جو نہ صرف انگلستان تک محدود ہے بلکہ یورپ کے ہر صنعتی ملک کا یہی حال ہے۔ یورپ میں بے روزگاری کے اسباب بین الاقوامی ہیں اور اس کا تعلق دنیا کی تجارت سے ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ بے روزگاری کے ہونے کی یہ وجہ ہے کہ بچوں کی تعلیم شروع ہونے کے قبل ہی سے والدین کو حکومتی اور خانگی اداروں کے ذریعہ یہ معلومات آسانی سے ہتیا ہوتے رہتے ہیں کہ کس قسم کے افراد کی اہمیت کس قسم کے پیشوں میں ہے یا ہونے والی ہے اور اسی لحاظ سے بچوں کو تعلیم دلائی جاتی ہے اور اس معاملہ میں بچوں کے ذہنی رجحانات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت کم طلباء فنون کی ڈگریوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اور جو ادھر آجاتے ہیں ان کے لئے پوری سلطنت برطانیہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن آجکل چونکہ شہنشاہی علاقوں میں بھی قومی جذبات ترقی پذیر ہیں لہذا انگلستان میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

نقائص یورپی طرز تعلیم کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے بادی النظر میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں کے تعلیمی حالات شاید بہترین ہیں اور ان میں اب مزید ترقی کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام ایشیائی ممالک کو تعلیمی معاملات میں یورپ کی اتباع کرنی چاہئے۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کے نظام تعلیم میں بعض بنیادی نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی سے یورپ کا رجحان ہر شے میں پیداؤں برپاؤں کی سرکوبی کی جانب رہا ہے جس کا اثر غیر شعوری طور پر تعلیمی ادارات پر بھی

پڑا جہاں سے فیکریوں یا کارخانوں کی کسی پیداوار کی طرح طلباء ایک مقررہ معیار کے بموجب جس کو عام اصطلاح میں 'امتحان' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے بڑی تعداد میں نکلنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل طلباء کی انفرادی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے بہت سے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں خاص کر تحافی تعلیم میں لیکن اس کے باوجود عام رجحان پیدائش برپا نہ کبیر ہی کی جانب ہے۔ یہ ایک بڑا نقص ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ تعلیمی نصاب اور ماحول کچھ اس قسم کا ہے کہ بین الاقوامی سطح نظر کے مقابلہ میں قومی نقطہ نظر پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقوام عالم میں باہمی کشمکش اور منافرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور جنگ کے لئے میدان صاف ہوتا ہے۔ بظاہر جنگ کے اسباب معاشی ہوا کرتے ہیں لیکن آجکل اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اقوام کو آپس میں ایک دوسرے سے نفرت ہے اور ہر قوم اپنے آپ کو ہر معاملہ میں دوسرے کے مقابلہ میں برتر و بالا سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان ہی خیالات کے پیش نظر تعلیمی نصاب بھی مرتب ہوتا ہے اور ابتدا ہی سے بچوں کے دلوں میں قوم پرورانه خیالات جاگزیں کئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یورپ اور سارے عالم کا امن برقرار نہیں رہ سکتا۔ لہذا افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یورپی طریقہ تعلیم نے دنیا میں ممکن ہے اچھے سائنس دان، صنعت اور سپاہی پیدا کئے ہوں لیکن امن پسند شہریوں کے پیدا کرنے میں یہ نمایاں طور پر ناکام ثابت ہوا۔ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ بعض قومی اور سیاسی لیڈروں کی وجہ سے عوام جنگ میں شریک

ہوتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک کسی قوم کے مزاج میں یہ رجحان نہ ہو جائے کہ اسے کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں صفت آرا ہونا ہے اس وقت تک ان پر کسی لیڈر کا اثر قائم نہیں ہو سکتا۔

اس بین الاقوامی مصیبت اور کشمکش کا اگر کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے یعنی یہ کہ اسن عالم کے قیام کے لئے یورپ اپنے تعلیمی نظام کی بنیادی نقطہ نظر سے نظر ثانی کرے کیونکہ قومی نقطہ نظر سے تعلیم دلانا اور بین الاقوامی امن کی توقع رکھنا دو متضاد سی چیزیں ہیں۔ یہ کام بجز مجلس اقوام کے تنہا کسی قوم سے ممکن نہیں ہے بعض وقت یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ فی زمانہ عورتوں کو پہلے کے مقابلہ میں حقوق نمائندگی حاصل ہیں اور وہ سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت سے مرد کے دوش بردوش ہیں اس لئے اسن عالم کے قیام میں ان سے بڑی مدد ملے گی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ عورتیں بھی آخر اسی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں جو مردوں کے لئے مقرر ہے۔ پیچ۔ جی ولس کے قول کے مطابق آج کل لوگوں نے قومیت کو اپنا قومی خدا بنا لیا ہے جو بین الاقوامیت کا دشمن ہے اور جب تک یہ دشمنی باقی ہے اسن عالم خطرہ میں ہے۔

ذاتی خصوصیت یورپ کے ہر خود مختار ملک میں حب الوطنی کا جذبہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے اور اگر قومی احساس اور ایثار کا مادہ کہیں زیادہ ہے تو انگلستان میں ہے۔ برخلاف اس کے ہندوئی اور حریت کے جذبات فرانس میں بڑھے ہوئے ہیں۔ جتنی باقاعدگی انگلستان میں ہے اتنی فرانس یا یورپ کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ البتہ عام اخلاق فرانس میں زیادہ خوشگوار نظر آتے

انگریز نہ صرف ہندوستانیوں سے دور اور علیحدہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اہل یورپ سے بھی انھیں خاصی اجنبیت ہے جس کی وجہ ان کے جغرافیائی حالات ہیں۔ اور یورپ کے جملہ شمالی ممالک کا یہی حال ہے۔ برخلاف اس کے جنوبی یا اطلینئی ممالک میں پڑوسیوں سے اتنی اجنبیت نہیں پائی جاتی ہے۔

انگلستان میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ رائج نہیں ہے لیکن جب ملک پر کوئی آفت آن پڑتی ہے تو ہر شخص اپنی جان و مال کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی جذبہ ایشاء دراصل انگلستان کی ترقی کا راز ہے۔ ایک معمولی انگریز بھی ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو ترجیح دیکتا خواہ اس میں اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ بردہا کرنا پڑے۔

انگلستان کی ہر جامعہ میں خانگی اشخاص کی جانب سے کثیر خرچہ جمع ہوتے ہیں تاکہ کسی خاص علم یا فن کی "کرسی" قائم کی جائے۔ قوم پرستی کا یہ عالم ہے کہ تعلیمی اور رفاہی کاموں میں حکومت سے زیادہ خانگی اشخاص کو دلچسپی ہے اور اکثر ادارے کلیتہً خانگی سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔

معیار زندگی | یون تو اہل یورپ کا معیار زندگی ہم لوگوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہے لیکن اس معاملہ میں خود یورپ کے ممالک میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انگلستان کا معیار زندگی اطالیہ سے بہت بلند ہے۔ جہاں معیار زندگی بلند ہو تو لازماً ہر شخص کا میلان خود مختارانہ زندگی کی طرف ہوگا چنانچہ انگلستان کی لڑکیاں بھی یہ گوارا نہیں کرتیں کہ چودہ پندرہ سال کی عمر کے بعد ان کے خور و نوش کا بار والدین پر پڑے۔ لیکن جہاں یہ انفرادیت جذبہ خود مختاری

نشو و نما کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے وہاں اخلاق پر بھی اس کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ مشرقی نقطہ نظر سے یہ چیز عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یورپ میں اگر بیٹا ضرورتاً باپ سے ایک ڈاک کا ٹکٹ بھی لیتا ہے تو اس کی نیت اس کو واپس کرنے کی ہوتی ہے یا وہ اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے۔ ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد بچے اپنے کھانے پینے کا خرچ والدین کو یا بندی سے ادا کرتے ہیں اور گھرانے کے لئے ہٹل بن جاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ملک کی صنعتی ترقی کا۔ اس سے خاندان کا قدیم تصور کمزور پڑ جاتا ہے اور انفرادیت کا جذبہ ترقی کرتا ہے۔ جہاں انفرادیت کا جذبہ انفرادیت یافتہ ہوا اور ہر شخص خود مختار رہے وہاں قومی تصورات بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ اپنوں سے بیگانگی ایک حد تک جائز سمجھی جاتی ہے لیکن قومی معاملات میں جذبہ ایثار دیوانگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انگلستان میں حکومت اور رعایا میں قدیم زمانہ کی طرح کسی قسم کی کشمکش نہیں پائی جاتی۔ یہ غالباً برطانوی دستور کی خوبی کی وجہ ہے۔ حکومت میں بظاہر دو جماعتیں ہیں۔ ایک حکومتی اور دوسری مخالف جماعت اور یہ دونوں اپنے اپنے نقطہ نظر میں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ لیکن جب قوم کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو لوگ تمام تفرقتیں بھول جاتے ہیں اور ملک میں ایک جماعت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ کے زمانہ میں اور حالیہ قومی حکومت کے وقت ایسا ہی ہوا جب کوئی خاص قومی اہمیت کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو دونوں جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے امور کو جماعتی سیاسیات سے بالاتر رکھا جائے۔

عورت | میرے اس سوال پر کہ یورپ کی عورتوں کی ترقی اور آزادی کی ہامی

عورتیں کہاں تک اتباع کر سکتی ہیں پروفیسر حسین علی مرزا نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب دینے کے قبل تہید کے طور پر بعض چیزوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یورپ کی عورتوں کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی ہے اور ہم میں بعض ایسے بھی لوگ ہیں جو وہاں کی عورتوں کو بہت ہی ترقی یافتہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں ان کی تقلید کریں۔ آپ نے ان دونوں خیالات کی مخالفت کی اور فرمایا کہ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اخلاق کے جانچنے کے لئے دو معیار ہیں۔ مردوں کے لئے ایک اور عورتوں کے لئے ایک ایک مثال کے ذریعہ اس کی یوں توضیح ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی مرد شراب خوار یا آوارہ ہو تو سوسائٹی اس کو اتنا برا نہیں سمجھتی۔ اس کے برعکس کسی ہندوستانی شریف گھرانے کی لڑکی اگر اپنی عمر میں ایک مرتبہ بھی شراب پی لے یا اتفاقی طور پر اس سے کوئی لغزش ہو جائے تو سوسائٹی کے نزدیک وہ بدترین گناہ کی مرتکب قرار پاتی ہے اور معاشرہ میں اُس کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔ یورپ میں عورتوں اور مردوں کے لئے ایک ہی معیار ہے خواہ وہ ان کی برائیوں سے متعلق ہو یا اچھائیوں سے۔ اگر شراب خوری یا آوارگی مردوں کے لئے جائز تصور کی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کے لئے یہ ناجائز قرار دیا جائے۔

یورپ کے اخلاقی حالات پر رائے قائم کرتے وقت ہم سے ایک اور غلطی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم غیر شعوری طور پر ہندوستان کے متوسط یا اعلیٰ متوسط طبقہ کے اخلاق کا مقابلہ عمومیت سے یورپ کے کام کرنے والے ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے اخلاق سے کرتے ہیں۔ ہم ان کی برائیوں اور کمزوریوں کو دیکھ کر اپنے اعلیٰ اطلاق اور کردار پر

دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا یہ مقابلہ بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ ہم صرف اپنے ایک طبقہ کا وہاں کی جملہ آبادی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ دونوں کے مقابلہ کا سا منصفک طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کی پوری آبادی کے محاسن و معائب کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور یورپ کے محاسن و معائب کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر دیکھا جائے تو فطرت انسانی دونوں جگہ ایک ہی نکلیگی۔ آپ کی رائے میں مال یہ نہیں ہے کہ سیاہ یا زرد لوگوں کی اخلاقی حالت اچھی ہوتی ہے اور سفید لوگوں کی خراب بلکہ اصل سوال دولت اور عسرت کا ہے۔ اگر اس چیز کو ایک عام مفہوم میں ادا کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انتہائی عسرت اور انتہائی دولت سے بد اخلاقی پیدا ہوتی ہے کیونکہ ایک صورت میں عیش و عشرت کی فراوانی ہوتی ہے اور دوسری میں ضرورت کی مجبوری۔ گویا صرف متوسط طبقہ ہی میں اخلاق کا ایک اعلیٰ معیار قائم رہ سکتا ہے۔

ہم لوگ دراصل معاشرتی اور عائشی ماحول کا نتیجہ ہیں اور ہمارے اخلاق کا بھی نسل اور رنگ کے بجائے ان ہی حالات پر دار و مدار ہے۔ پروفیسر حسین علی مرزا کا خیال ہے کہ جماعتوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے آپس کے میل جول سے ان میں جنسی ترغیبات کا سد باب ہو جاتا ہے اور جہاں ہم تعلیمی طریقہ کا رواج نہیں ہے وہاں یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہندوؤں یا عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں جذبات شہوانی زیادہ ہیں جس کی وجہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم گوشت خوار ہیں حالانکہ اہل یورپ ہم سے زیادہ گوشت کے عادی ہیں۔ یہاں مسلمانوں سے مراد عامۃ الناس اور وہ لوگ ہیں جن پر مذہب اور

اسلامی تہذیب کا کوئی خاص اثر نہیں اور جو تہذیب جدید کی تقلید میں اندھے ہو گئے ہیں۔ ہمارے مدارس اور تعلیمی ادارات میں مسلمان طلباء، جتنی غلط کاریوں کا شکار ہوتے ہیں اتنے دیگر اقوام کے طلباء نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے تمدن میں عورت اور مرد کے میل جول کے مواقع نہیں ہیں۔ جس نظر سے ہم اپنے گھر کی عورتوں کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے باہر کی عورتوں کو نہیں دیکھتے۔ عورت ہمارے لئے ایک معتمہ ہے۔ عورت کے متعلق مسلم نوجوانوں میں جتنا تجسس پایا جاتا ہے اتنا دیگر اقوام کے نوجوانوں میں نہیں پایا جاتا کیونکہ انہیں اپنے گھر کی عورتوں کے سوا غیر عورتوں سے گھل ملنے کے مواقع حاصل ہیں جن سے بڑی حد تک جنسی ترغیبات پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ بہر کیف یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر مصلحان قوم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔

یورپ کی تقلید | پروفیسر حسین علی مرزا کا خیال ہے کہ ہماری عورتوں کے لئے یورپ میں عورتوں کی تقلید ہلک ثابت ہوگی۔ اس کے ہرگز معنی

نہیں کہ ہم قدامت پرست رہیں۔ معاشی اور سائنٹیفک ترقیات اور اصلاحات کی حد تک ہمیں یورپ کی پیروی کرنی ضروری ہے لیکن ہمیں کسی ایسی تقلید کی ضرورت نہیں جس سے ہماری تہذیب و تمدن اور قومی خصوصیات کو نقصان پہنچے۔ ہماری تہذیب و تمدن کی اصلی خصوصیات کو قائم رہنا چاہیئے۔ ترکی کی ترقی کا یہیراز ہے۔ اسلحہ جنگ اور دیگر قومی ضروریات کی حد تک ترک یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں ہیں مگر ترکی تہذیب کا دامن انہوں نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اور اپنی قومی وحدت اور وقار کو قائم رکھنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے ہم کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے مثلاً، موٹر، ہوائی جہاز، مشین گن، وائرس، ریڈیو وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے بغیر آجکل کسی قوم کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ لیکن خانگی زندگی میں یورپ کی تقلید کرنا اپنی تہذیب کا گلا گھونٹنا ہے۔ کیا میز کرسی اور کاشے چہری کے استعمال ہی سے ہم ترقی یافتہ کہانیٹنگے اور بغیر اس کے نہیں۔ بعض لوگوں کے بچوں کی زبان پر اماں، اور ابا کے بجائے ”ماما“ اور ”پاپا“ کے الفاظ ہیں۔ جب ہماری زبان میں پہلے ہی سے الفاظ موجود ہوں تو دوسری زبان کے الفاظ کے اختیار کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک یورپیٹا حیدر آبادی صاحب کا واقعہ بیان فرمایا۔ یورپ میں معمر عورتوں کے حسن اور جوانی کی تعریف کی جائے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ایک صاحب نے یورپ سے واپس آنے کے بعد اپنی ماں کی کچھ ایسی ہی تعریف کی جس پر وہ بیجاری تین روز تک روتی رہی۔ بھلا مشرقی تہذیب ان چیزوں کی متحمل ہو سکتی ہے۔

مغربی تہذیب کس طرح غیر محسوس طور پر ہمارے تمدن کو تباہ کر رہی ہے اس کا اندازہ اس معمولی واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک انگریز نے جویر و سیاحت کی غرض سے حیدر آباد آیا ہوا تھا ہندوستانی بچوں کے کھلونے دیکھنے کی خواہش کی کیونکہ اس سے کسی ملک کے تمدن اور ذہنی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے لیکن باوجود تلاش کے کسی گھر میں یہ دستیاب نہ ہو سکے۔ ہر جگہ مغربی کھلونوں ہی کی بھرمار تھی۔ بالآخر نواب سالار جنگ بہادر سے استدعا کی گئی اور موصوف نے قدیم بزم کی کچھ گڑیاں بنوا کر اس انگریز کو عنایت فرمائیں۔ بہر کیف مغربی طرز زندگی کی تقلید

اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ نہ صرف قرض کی مصیبت ہی مول لینی پڑتی ہے بلکہ ہر جائز و ناجائز طریقوں سے آمدنی میں اضافہ کی کوشش کی جاتی ہے حتیٰ کہ آجکل فوجوں اپنی شادی بھی اس مقصد سے کرتے ہیں کہ بیوی کے پیسہ سے ٹھاٹھ کئے جائیں۔ مغربی عورتوں سے شادی کے متعلق پروفیسر حسین علی مرزا نے فرمایا کہ رفتہ رفتہ یہ چیز ہماری نسل اور خون کی خرابی کا باعث ثابت ہوگی اور ہماری حیثیت آئندہ چل کر چٹیکا رونکی سی ہو جائیگی۔ ایک انگریز عورت سے شادی کرنے کے بعد کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہماری تہذیب و تمدن کے اعلیٰ روایات برقرار رہ سکیں اور کیا ہماری اولاد ان چیزوں کی جائز وراثت ہو سکتی ہے جو ہماری شہادت کا جو لانیفک ہیں۔ اور پھر اس شادی کے معاملہ میں بھی ہم میں وہی دو عملی ذہنیت کا فرق رہے۔ جس طرح ایک ہندوستانی نوجوان ایک مغربی عورت سے شادی کر لیتا ہے کیا وہ اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بیٹی یا بہن یا کوئی اور قریبی عزیزہ کسی غیر قوم کے مرد سے شادی کرے۔

؟ ڈاکٹر بے سوریہ

(*)

ڈاکٹر بے سوریہ ایم۔ ڈی (برلن) مسز سروجنی ٹانڈو کے فرزند
اکبر ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ ڈاکٹر ہیں لیکن معاشیات و اقتصادیات
سے بھی آپ کا غیر معمولی دلچسپی ہے اور ان علوم میں آپ کو اچھی بصیرت
حاصل ہے۔ اپنے تیرہ سالہ قیام یورپ میں آپ نے جرمنی، روس
انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کا غائر فطر سے مطالعہ کیا ہے۔
آپ کا قیام یورپ میں سترہ تا سترہ رہا۔

برطانوی تہذیب جب یورپ اور یورپین تہذیب کا ذکر آتا ہے تو اکثر
ہندوستانی غیر ارا دی طور پر برطانوی تہذیب مراد لیتے ہیں
اس خام خیالی کی بادی النظر میں یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپین زبانوں کے
منجملہ ہم صرف انگریزی زبان ہی سے واقف ہیں اور بعض ایسے بھی اسباب
ہیں (جوفی الوقت ہمارے قابو سے باہر ہیں) جس کی وجہ سے ہم انگلستان کو

تات عالم سمجھنے پر مجبور ہیں کیونکہ برطانوی ڈگریوں کو ہندوستان میں سارے جہاں کی ڈگریوں کے مقابل میں "شاہی ترجیح" حاصل ہے۔ اور یہ ڈگریاں تجارتی نقطہ نظر سے اتنی ارباب بھی ہیں کہ ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص انگلستان جا کر اگر کوئی خانگی اتالیق (جس کی فیس زیادہ ہوتی ہے) مقرر کر کے تو وہ آسانی سے کوئی نہ کوئی ڈگری یا ڈپلوما لیکر واپس آ جاسکتا ہے اور یہاں اس کی قدریں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اسے کم از کم کسی دیسی ریاست میں تو ایک اعلیٰ ملازمت مل جاتی ہے۔

ہندوستانی اچھوت لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اوسط طالب علم جو اس تجارتی ڈگری کے حصول کے لئے انگلستان جاتا ہے اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ وہاں کی سوسائٹی میں گھل مل سکے۔ بجز انگلستان کی بعض مشہور گلیوں اور سمندری تفریح گاہوں کے وہ کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکتا۔ علاوہ انہیں دیکھنے کیلئے وقت درکار ہے اور پیسہ بھی اور ہمارے طالب علموں کو یہ دونوں پس نہیں۔ دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ انگریز بچے کے طبقے سے نیکراو پٹے طبقہ تک ہندوستانیوں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ انگلستان کے قیام کے زمانہ میں براعظم کا جو سفر کیا جاتا ہے وہ بالکل اچھوتا ہوتا ہے اور اس کا دائرہ پیرس اور برلن کے شبہ بسروں اور عیش گھروں سے آگے نہیں ہوتا۔

یورپ سے سبق لیکن ہندوستانی طلباء میں بعض نوجوان لمبا ئع ایسے بھی ہوتے ہیں جو یورپی زندگی کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہتے ہیں اور سطح سے نیچے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اشیاء کے باہمی تعلق پر نظر کر کے یہ معلوم کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ آیا ہندوستانی مسائل کا حل اکسفر ڈکا

ہجرجا حاصل کرنے سے ہو سکتا ہے یا کس فورڈ کی تعلیم ہی محض بیکار ہے جس سے ہندوستانی مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن ان بیچاروں کو بڑی وقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف ان کی پڑھائی ہے، ان کے اور پروفیسروں کے آپس کے تعلقات ہیں، انڈیا آفس کے منکرنیہ ہیں اور گھر کے لوگ ہیں جو ان سے کسی اور چیز کی توقع نہیں رکھتے بجز اس کے کہ وہ تعلیم ختم کر کے گھر واپس آجائیں اور ایک اعلیٰ خدمت حاصل کر لیں۔ ایسی صورت میں وہ کربھی کیا سکتے ہیں۔ لیکن آخر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یورپ ہے کیا چیز اور وہاں کی کونسی چیزیں ہمارے ملک کے لئے کارآمد ہو سکتی ہیں اب وقت آگیا ہے کہ ہم کھلے بندوں اس امر کا انکار کر دیں کہ ہم یورپ سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے بجز ایک چیز کے اور وہ اعلیٰ اصطلاحی تعلیم ہے جس سے ہندوستان جیسا زرعی ملک نفعی ملک بن سکے۔ اصطلاحی تعلیم میں سائنس کے تمام شعبہ جات داخل ہیں بشمول طب کے اور اس سلسلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے لئے جارا اور تنزل پذیر یورپ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ امریکہ، روس اور جاپان ہیں۔ ڈاکٹر مٹاکا کو سخن ویسی ریاستوں کے ان نام نہاد بلند حوصلہ لوگوں سے نہیں ہے جو کم از کم چھ ماہ ہی کے لئے یورپ جا کر اپنی قدر میں اضافہ کر کے ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو یورپ کو علم کی خاطر علم حاصل کرنے جاتے ہیں اور ایسے علم کی خاطر جس کا ہندوستان میں انتظام نہیں ہے۔ ڈاکٹر جے سو ریا کا خیال ہے کہ قانون، فلسفہ یا تاریخ کی تعلیم کے لئے یورپ جانا عبث ہے اور اس سے ہندوستان کو اب یا آئندہ کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یورپ میں انتشار | یورپ میں اس وقت ایک انتشار کی کیفیت برپا ہے۔ جن اشیاء کی قدر کل تک معین تھی ان میں مسلسل تغیر ہوتا جا رہا ہے اور معاشی حالات دن بدن اترتے جا رہے ہیں۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لئے آئے دن نئے نئے حل پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یورپ ایک تاریک غار کی طرح بڑھا جا رہا ہے جس کو عبور کرنے کی ممکنہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان تمام لائیل مسائل کا ایک حل - جنگ ہے یعنی انوار عالم کی خودکشی برہیمانہ کبیر تنزل پذیر یورپ کے لئے بجز اس کے کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہندوستان کا افلاس | جہاننگ ہندوستان کا تعلق ہے دوزبردست مسائل ہمارے سامنے ایک بیجانک منظر لئے ہوئے پیش ہیں اور جو تقریباً لائیل نظر آتے ہیں بھوک اور افلاس۔ لہذا آئندہ ہم جو بھی تعلیم حاصل کریں اس کا تعلق ان مسائل کے حل سے ہونا ضروری ہے۔ اب تک ہم نے جو بھی تعلیم حاصل کی وہ بیکار ثابت ہوئی کیونکہ اس سے ہمارے مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملی بلکہ الٹا تعلیم یافتہ بے روزگاری کا مسئلہ ہمارے مسائل میں ایک نیا خوشگوار اضافہ ہے۔ ہندوستان دو تہہ ترین ملک ہے جہاں کے لوگ مفلس ترین ہیں۔ کچھ دنوں قبل مجلس اقوام کے شعبہ تہذیب و تمدن کے ایک رکن بیاسل میا تھیل نے ہندوستانی نوجوانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ نوجوانوں میں اس وقت تک انتشار اور بے چینی رہیگی جس وقت تک کہ لوگوں کے افلاس اور بھوک کا علاج نہ کیا جائے گا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستانی کاشتکاروں کے زرعی

قرض کی مقدار پسند رہ سو کروڑ روپیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں بھوکے مقروض لوگوں سے جو اپنی غذا تک نہیں خرید سکتے دوسری اڑناں ترین اشیاء کے خریدنے کی کیا توقع کیجا سکتی ہے جو تمدن زندگی کے معمولی احتیاجات میں داخل ہیں۔

افلاس کا علاج | تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا یورپ یا کسی اور بیرونی ملک کی کسی چیز سے ہم کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں! اصطلاحی تعلیم سے صنعتی

ترقی اور صنعتی نظام کے طریقوں سے ہمیں چاہیئے کہ پہلے ہندوستانی معاشیات کے بنیادی مسائل کا جائزہ لیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان میں کونسی خرابیاں ہیں اور یہ کیسے دور بہکتی ہیں۔ بھوکے لوگ جنھیں جیلخانوں کے قیدیوں کے مقابل میں بھی کم غذا ملتی ہے جو کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ٹھنڈے ہوئے ہیں ان سے بھلا کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پیدائش

دولت میں حصہ لیں یا تمدن کی ابتدائی چیزوں کو اختیار کریں۔ وہ محض اس لئے زندہ ہیں کہ انھیں مرنا نہیں آتا اور نہ انھیں اس وقت تک زندگی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے جب تک کوئی ایسے ہلکا اور متعدی امراض جو ہندوستان اور چین جیسے افلاس زدہ ملکوں ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں ہزاروں کی تعداد میں انھیں فنا کی نیند نہیں سلا دیتے۔ کیونکہ ان کے خون

میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لہذا ہمیں یہ معلوم کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کہ انھیں کیا کھانا دیا جائے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ انکی قوت خرید میں ہم کیسے اضافہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکیں جب تک اس مسئلہ کا حل نہ ہوگا اس وقت تک ہر قسم کی دیہی تنظیم دیہی طبی امداد اور دیگر اصلاحات کا خیال ہی بیکار ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو یورپ بلکہ امریکہ، جاپان اور روس سے بجز

اصطلاحی تعلیم کے کچھ اور حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہی چیز ممکن ہے ہماری نجات کا ذریعہ ثابت ہو۔

مٹریس ایم۔ ہادی

مٹریس ایم۔ ہادی بی۔ اے (کنٹ) سررشتہ بائے اسکولس کراچی کے ناظم ہیں۔ ایک اسپورٹسمن کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ آپ کاشمارٹینس کے بہترین کھلاڑیوں میں رہا ہے اور ڈیوس کپ میں آپ نے ہندوستان کی نمائندگی بھی کی ہے۔

انگلستان میں آپ کا ابتدائی قیام ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۷ء رہا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء میں بھی آپ نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ اس کے خازن اعزازی کی حیثیت سے آپ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔

انگریزوں کی خصوصیات | انگلستان کی زندگی میں تین چیزیں سب سے زیادہ جاذب نظر ہیں۔ فرض شناسی، ضبط و تنظیم اور اخلاق اور یہی انگریزوں کی ترقی کا راز ہیں۔ اپنے لیڈر کی عزت و تعظیم کرنے میں

ہم کو انگریزوں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ سفر انگلستان میں اسی ایک چیز کے نہ ہونے سے ہماری شہرت اور نیکنامی کو صدمہ پہنچا۔ اگر بغرض محال ہندوستانی ٹیم کے کپتان سر مہاراج کمار وجینگم اہلیت کے جوہر سے عاری تھے تو اس کے متعلق انتخاب کے پہلے ہی غور و خوص ہو جانا چاہیئے تھا۔ انتخاب کے بعد اس سوال کو اٹھانا ہی بیکار تھا۔

جسمانی نشوونما | میرے اس سوال پر کہ آیا ہم میں کوئی جسمانی انحطاط ہے جس کی وجہ سے ہم اہل یورپ کا کھیل کود میں مقابلہ نہیں کر سکتے مسٹر سیم ہادی نے فرمایا کہ ہم میں جسمانی انحطاط تو نہیں ہے۔ البتہ ہماری تربیت اور نشوونما کے طریقوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس بچوں کی فطری قابلیتوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ لکیر کے فقیر کی طرح بچے مدرسے میں شریک کر دیئے جاتے ہیں اور والدین یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بوجھ کو استادوں کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اور اس طرح ہر قسم کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ علاوہ انہیں والدین بچوں کی پڑھائی پر اتنا زور دیتے ہیں کہ بچوں کی جسمانی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اصولاً دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی تعلیم میں توازن قائم رہنا ضروری ہے۔ اکثر بچوں کا فطری میلان کھیل کود کی طرف ہوتا ہے اور اگر ایسے مواقع ہم پہنچائے جائیں تو کھیل کود ہی میں وہ بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ لیکن انھیں موقع نہیں ملتا۔ غام طور پر متوسط اور غریب طبقہ کے لوگ بچوں کو اس وجہ سے بھی کھیل کود میں زیادہ حصہ لینے نہیں دیتے مبادا وہ اسی کے ہنور ہیں اور خاندان کی جو توقعات ان سے وابستہ ہیں وہ پوری ہنوں۔

علاوہ ازیں کھیل کود کے معاملہ میں ہمارے یہاں کی فضا حوصلہ شکن ہے۔ ہمارے کھلاڑی کو خاطر خواہ تحریریں اور ترغیب نہیں ملتی۔ حکومت تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتی، دولت مند لوگ اور خانگی ادارے اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ انگلستان میں عام طور پر جامعاتی ڈگریوں کے مقابلہ میں کیمبرج یا آکسفورڈ سے (بلیو) لینے والوں کو زیادہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

ساتھ ہی ہمارے کھیل کود کی حالت منظم نہیں ہے۔ ملک میں تنظیمی قابلیت و ہلوں کی کمی نہیں لیکن ہمارے افلاس اور عدم توجہی سے کوئی سرمایہ فراہم نہیں ہوتا اور ہر چیز میں محض حکومت پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا۔

کھیلوں کے میدان | ہمارے پاس کھیل کود کے میدانوں کی بڑی کمی ہے یہی چیز وہبلڈن میں بچپس ہزار ناظرین وقت واحد میں سنٹرل کورٹ کا کھیل دیکھ سکتے ہیں

یہاں پر ۱۹۲۱ء میں اسٹیڈیم تعمیر ہوا اور پہلے ہی سال اس کے حصہ داروں کو پانچ فیصد منافع ملا اور آجکل منافع کی مقدار (۴۵) فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ معین الدولہ کرکٹ ٹورنمنٹ میں ڈیروں کی تنصیب سے ہمشکل دو ہزار روپیہ کرایہ وصول ہوتا حالانکہ ڈیرے لگانے والے کافی منافع حاصل کرتے ہیں۔ حسین ساگر کٹھ کے زیریں میدان میں ایک اسٹیڈیم تعمیر کرنے کی تحریک عرصہ سے حکومت سرکار عالی کے پیش نظر ہے جو نہ صرف جاری ریاست کے وقار کے شایان شان ہے بلکہ اس میں حاجی نوجوان نسلوں کے لئے بھی بے حد فوائد جہنم ہیں۔

عورت | مسٹر ایس۔ ایم بادی ہمارے موجودہ چار دیواری کے پردے میں تربیت

حامی ہیں۔ آپ کے خیال کے بموجب یورپین عورتوں کو ورزش کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ہماری عورتوں کو ہے۔ لہذا ان کے کھیل کود کے لئے دو ایک ایسے میدان مخصوص ہونے چاہیں جہاں عورتیں ہر شام جمع ہو سکیں اور جہاں پروے کا بھی کافی انتظام ہو۔ عورتوں کے لئے فٹ بال یا دوسرے کھیلوں کے مقابلہ میں بالکی اور ٹینس بہتر ہیں بلکہ ہمارے زمانہ مدارس میں ان کھیلوں کا رواج ہونا چاہیئے اور ان کے ٹوٹنٹ بھی ہونے چاہیں۔

یورپ کی عورتوں کی آزادی کے بیان کرنے میں ہمارے پاس انتہائی مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بہت سے ایسے شریف خاندان ہیں جہاں عصمت مشرقی معیار تہذیب کے مطابق قائم ہے۔ عورتیں عام طور پر اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میرے اس اعتراض پر کہ اس سے گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے مسٹر ہادی نے فرمایا کہ ممکن ہے ایک حد تک یہ خیال صحیح ہو لیکن اس سے خاندان تباہی سے بچ جاتا ہے۔ اگر خاندان میں ایک مرد کانے والا اور وہ فوت ہو جائے تو خاندان کے لئے بجز بھیک کے کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر عورتیں پہلے ہی سے اپنی روزی آپ کماتی ہیں تو وہ اس قسم کی شدید صورت حال کا آسانی سے مقابلہ کر لے سکتی ہیں۔

یورپ میں بڑے بڑے گھرانے کی عورتیں باوجود تمول کے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے لارڈ سو آٹلنگ آجنہانی کے خاندان کا تذکرہ فرمایا جو لارڈ مانٹنگوزیر ہند کے بڑے بھائی تھے ان کی خاندانی شرافت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہ جارج پنجم آجنہانی بھی ان کے پاس

ایک روز وہاں تھے۔ لیڈی سواتلنگ کے متعلق آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بہترین بیوی بہترین ماں اور بہترین میزبان تھیں۔ ایک مرتبہ مسٹر ایم ہادی ان کے مکان میں بیمار ہو گئے تو ان کی تیمارداری میں انہوں نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی حتیٰ کہ جب انہیں خیال ہوا کہ ممکن ہے انگریزی کھانوں سے آپ کی طبیعت اکتا گئی ہو تو مسٹر علی امام کو جو بار کے معاملہ میں لندن آئے ہوئے تھے ٹیلیفون کیا گیا اور ان کے پاس سے کچھڑی اور پاؤں کا انتظام ہوا۔

ترک تقسیم ہونے کے بعد لیڈی سواتلنگ کی اکلوتی لڑکی اپنی ماں کو گھر کا کرایہ اور اپنے کھانے کے اخراجات ادا کرتی تھی اور جو ایک دکان لگا کر اس میں کام کیا کرتی تھی۔ جب مسٹر ایم ہادی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو لیڈی سواتلنگ نے ہنس کر فرمایا کہ جب تک جائیداد غیر منقسم تھی اور لڑکی خاندان کی دستگیر تھی تو اس کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کیا گیا لیکن جب وہ خود ایک جائیداد کی مالک بن گئی ہے اور اس کی اپنی ایک دکان بھی ہے تو دوسرے اس کا باریکوں اٹھانے لگے۔ یہ دراصل انگلستان کی کاروباری ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

نسلی تعصب میرے اس سوال پر کہ کیا انگلستان میں کہیل کو دکی دنیا میں بھی نسلی تعصب پایا جاتا ہے مسٹر ایم ہادی نے فرمایا کہ بد قسمتی سے اسپورٹ کی دنیا میں بھی یہ چیز موجود ہے جس کا خود آپ کو کیمبرج میں شکار ہونا پڑا۔ آپ کو محض ٹینس کے بہترین کھلاڑی ہونے کی وجہ سے سٹیم میں بلیو ملا۔ اس کے کچھ دنوں بعد کیمبرج یونیورسٹی کی ایک ٹینس ٹیم بلجیم روانہ کی گئی جس میں سرز ہادی اور راماسوامی بھی شریک تھے۔ روانگی کے قبل ٹیم کے کپتان نے ان دونوں

کہا کہ چونکہ بلجیم میں نسلی تعصب زیادہ ہے لہذا ان دونوں کے کیلئے کے لئے خاص طور پر اجازت حاصل کی گئی ہے۔ یہ چیز مسٹر ہادی کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ علاوہ ازیں بلجیم پہنچنے کے بعد ان دونوں ہندوستانیوں کی رہائش کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا اور ٹیم کے بقیہ لوگ ایک فیملی میں ٹہرے۔ اس واقعہ کو بھی آپ لوگوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جب صبح شروع ہوئے تو آپ دونوں اپنے کھیل اور انشاق کی وجہ سے بچہ مقبول ہو گئے۔ ہر شخص ان کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔ لیکن رہ رہ کر مسٹر ہادی کو ہندوستانیوں کی سبکی کا خیال تار رہا تھا۔ آپ سے رہا نہیں گیا۔ آپ نے بلجیم ٹیم کے کپتان سے سارا واقعہ بیان کیا اور ان کے اس طرز عمل کی مذمت کی جس پر اس نے برہم ہو کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنی صفائی میں کیمبرج ٹیم کے کپتان کا وہ خط پیش کیا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ ٹیم میں دو ہندوستانی کھلاڑی بھی ہیں جن کے متعلق ممکن ہے بلجیم میں اعتراض ہو لہذا انھیں خاص طور پر کیلئے کی اجازت دیجائے۔ کیمبرج ٹیم کی واپسی کے بعد حکومت بلجیم نے سرکاری طور پر اس غلط بیانی کے خلاف احتجاج کیا جس کی انگلستان نے معذرت چاہی۔

اسی طرح مسٹر یس ایم ہادی کے کپتان منتخب ہونے کے وقت ایک شور مچایا گیا۔ کیمبرج میں کپتان کا انتخاب وہاں کے "بلیو" کرتے ہیں۔ آپ سب میں سینئر تھے لیکن انتخاب کے قبل کلب کے صدر نے آپ سے خواہش کی کہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے آپ کے انتخاب سے یونیورسٹی کے روایات کو صدمہ پہنچے گا اور پبلک میں چھی میگوئیاں ہوں گی۔ لہذا مناسب یہ ہے کہ آپ پاکستانی کے لئے کھڑے ہی انہوں اس سے آپ کے قومی جذبات کو سخت

ٹھہیں لگی اور آپ نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا۔ لیکن جب آپ کے ساتھ انتخاب کنندگان کا طرز عمل ناقابل برداشت ہو گیا تو آپ نے یونیورسٹی کو رٹ پر کھیلنا ہی چھوڑ دیا اور دوسری جگہ کیلئے لگے۔ یہ بات عام ہو گئی۔ اخبارات میں چرچے ہوئے۔ آپ کے بیانات شائع ہونے لگے حتیٰ کہ ہما تاکا ندھی نے بھی ”ینگ انڈیا“ میں اس پر تبصرہ کیا۔ بالآخر اس نازک صورت حال پر آپ کو کپتان منتخب کر کے قابو حاصل کیا گیا۔ اس سارے جھگڑے میں آپ کو افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے دو ہندوستانی ساتھیوں میں سے ایک نے ساتھ نہیں دیا۔ دوسرے سال بلجیم جانے والی ٹیم کا آپ کو کپتان بنایا گیا جس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی اپنی سابقہ خفت کو مٹانا چاہتی تھی۔ لیکن آپ سے ٹیم کی اس کامیابی کا انتقام لہی میں لیا گیا۔ اور لہی کے بہترین کھلاڑی ہونے کے باوجود آخر وقت تک آپ کو اس کا ”بلیو“ نہیں ملا۔

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی ناکامی | ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ سفر انگلستان کی ناکامی کے وجود دریافت کرنے پر مسٹر میس ایم ہادی نے جو اس ٹیم کے اعزازی خادون تھے، فرمایا کہ چارے کھلاڑیوں میں قومی احساس کی کمی ہے ہر شخص اپنے ملک کی نیکنامی سے زیادہ اپنی شہرت کا خواہاں تھا۔ کھلاڑیوں کی انانیت، خود غرضیاں، رقابتیں اور مرکز و سرگردگی نے ہندوستان کی شہرت کو ناقابل بیان نقصان پہنچایا۔

خاتمہ ہم میں ڈسپلن کی بڑی ضرورت ہے۔ یورپ میں اسپورٹس کو فوجی ڈسپلن سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی نے اس کی وجہ سے جو غیر معمولی قوت

بہم پہنچائی ہے اس سے سیاست حاضرہ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ حال ہی میں یعنی ماہ جون ۱۸۷۳ء میں جسمانی تعلیم اور اسپورٹس کے لئے فرانس میں ایک وزارت قائم ہوئی ہے کیونکہ یورپی ممالک یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ سلطنت کے دیگر امور کے مقابلہ میں جسمانی تربیت کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔

آخر میں مسٹر ایس ایم ہادی نے فرمایا کہ ہر ہندوستانی کو اپنے ملک کی عرب اور ناموس کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ جو لوگ ہندوستان سے غیر ملک تعلیم یا سیاحت کی غرض سے جاتے ہیں انہیں اپنے ملک کا سفیر بنکر جانا چاہیئے کیونکہ ایک فرد کے اطوار اور کردار سے سارے ملک اور قوم کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔



۲۰۰۵

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم م۔ اے۔ پی۔ یچ۔ ڈی (ایڈیٹر) جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ کے صدر ہیں۔ ایک بلند پایہ شاعر، مقرر اور ادیب کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ فلسفہ روحی آپ کا خاص مضمون ہے، جس پر آپ نے اپنا مقالہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

آپ کا قیام جرمنی میں ۲۲ سالہ رہا۔ کچھ دنوں لندن اور کیمبرج میں بھی آپ نے تحقیقات فرمائی ہیں۔ ۳۳ سالہ میں بھی چھ ماہ کے لئے آپ یورپ تشریف لے گئے تھے اور یہ مدت آپ نے فرانسیسی زبان کے حصول میں صرف کی اور جامعہ سوبورن (پیرس) میں شریک رہے

یورپ کی ترقی کے دور | میرے اس سوال پر کہ یورپ کی ترقی کے
کیا اسباب ہیں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے فرمایا
کہ مشرقی یورپ کے اکثر ممالک ہندوستان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ ترقی یافتہ

نہیں ہیں۔ لیکن جو مالک واقعی ترقی یافتہ ہیں مثلاً انگلستان، جرمنی اور فرانس ان کی ترقی کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ہم کو گزشتہ دو تین سو برس پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی ترقی کی ابتدا انشاۃ جدیدہ سے ہوتی ہے جبکہ قسطنطنیہ پر ترکی قبضہ کے بعد یونانی عالموں کی جماعت نے اقصائے یورپ میں پھیل کر سارے یورپ میں علم کی روشنی پھیلانی، علوم و فنون کی اس اشاعت نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر یورپی ممالک نے کلیسا کے جوئے کو اتار پھینکا۔ یورپ کی ترقی کی یہ دوسری منزل ہے۔ یورپ کا تیسرا قدم جو ترقی کی طرف اٹھا وہ بحری راستوں کی دریافت ہے جس سے نہ صرف یورپین ممالک کی تجارت کو فروغ ہوا بلکہ کمزور قوموں پر تسلط قائم کرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ اس کا بانی مہمانی واسکو ڈی گاما ہے جس کو ہندوستان کا راستہ احمد نامی ایک عرب نے بتلایا تھا۔ کاش احمد کو معلوم ہوتا کہ اس گم کردہ راہ کو راستہ بتلانے میں اکثر مشرقی اقوام کی قسمتوں میں غلامی لکھی جانے والی ہے۔

جہاز رانی کے فروغ کے ساتھ یورپ کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ اس جہاز رانی سے یورپی ممالک نے سب سے پہلے لوٹ اور غارتگری کا آغاز کیا۔ چنانچہ انگلستان کی ترقی کی بنیاد لوٹ پر قائم ہوئی۔

انگلستان کی قومی دولت کی ذراوانی اور خوشحالی کی ابتدا ملکہ الیزبتھ کے دور حکومت سے ہوتی ہے۔ یہ سو لھویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے۔

ڈریک کو ہسپانوی بیڑے کو ہٹانے کی اس شرط پر اجازت دی گئی کہ مال غنیمت

ملکہ کا بھی حصہ رہیگا۔ اسی حصہ کی بدولت ملکہ الیزبتھ نے نہ صرف اپنا قرض ادا کیا بلکہ دیگر اخراجات کے بعد بھی کافی دولت بچائی۔ ڈریک کی حوصلہ مندی کی وجہ سے جب ملک میں سونے کی بہتات ہوئی تو اکثر لوگوں نے اس کے مصروف پر غور کیا اور ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے تجارتی کمپنیاں قائم کی جائیں جو دنیا کے مختلف ممالک سے تجارتی تعلقات پیدا کریں۔ یہیں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدا ہوتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان کی آبادی کم تھی اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ سوچنے والے دماغ اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ کس طرح کم سے کم لوگوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ یہیں سے ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہی چیز صنعتی انقلاب کی محرک ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگلستان کے جن لوگوں کے ہاتھوں میں ٹریک کی وجہ سے دولت آگئی تھی وہ طبقہ جاگیرداران سے نہیں تھے۔ ملک میں عوام کا ایک نیا طبقہ پیدا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ نہ صرف دارالعوام کی تقویت کا باعث ہوا بلکہ جس سے نظام پارلیمانی میں استحکام اور برطانیہ کی طاقت میں اضافہ بھی ہوا۔

یورپ کی ترقی کا راز سائنس کی ترقی دراصل صنعتوں کی ترقی کا نتیجہ ہے اور صحیح معنوں میں سائنس اور صنعت کی ترقی ہی

یورپ کی ترقی کا راز ہیں۔ انگلستان کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ایک چھوٹا جزیرہ ہے۔ بلحاظ آبادی انگریزوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن نسل زبان اور مذہب کے اعتبار سے یہ لوگ ایک ہیں۔ ان میں قومی ہمدردی اور یک رنگی پیدا

ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ ساتھ ہی براعظم کی دوسری بڑی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لئے بھی ان میں اتحاد و یکجہالت کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

یورپ کی ترقی میں انقلاب فرانس کو بھی بڑا دخل ہے جس سے حریت، آزادی اور جمہوری خیالات کی ترویج میں بڑی مدد ملی۔

مغربی یورپ کی ترقی کا ایک بڑا سبب عیسائیت سے بیزاری اور بغاوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب بہت بڑا ہے۔ دنیا میں کسی مذہب کی اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی کہ عیسائیت کی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے پیروؤں کے سارے قوائے ذہنی و عقلی کو سلب کر لیا تھا اور افراد کو دنیا میں ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ عیسائیت سے سچا چھڑانے کے بعد لوگوں نے از نو زندگی کے نئے نئے تجربات کرنے شروع کئے۔ سوسائٹی، مذہب، اخلاق، قانون، سیاسیات، غرض ہر چیز کے متعلق تحقیقات کے دفتر کھلنے لگے اور یورپ کی وہی کیفیت ہو گئی جو کسی زمانہ میں یونان کی تھی جہاں سقراط، ارسطو اور دیگر مفکرین نے آزادی فکر کے ذریعہ حیات انسانی سے ساری مزاحمتوں کو ہٹا دیا تھا۔

مگر اس تمام ترقی اور آزادی کا فائدہ متوسط اور تجارتی جماعتوں کو پہنچا۔ مزدور پیشہ لوگ ان تمام انقلابات سے غیر متاثر رہے۔ لہذا آخر میں ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جس میں مزدور پیشہ لوگوں کو ابھرنے کا موقع ملتا۔ «عوام الناس کے انقلاب» کی ہی ابتداء ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عام مغلطہ دو ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مشرقی ممالک میں

یہ خیال عام ہے کہ یورپ نے مادی ترقی کی ہے اور روحانیت سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے اور اس کے پیدا ہونے کی یہ وجہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں فطرت کی قوتوں کو سمجھنے اور ان کو بروئے کار لانے میں دینا نے اتنی سرعت سے ترقی کی ہے کہ گذشتہ دس ہزار سال میں بھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی مادی ترقی سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور اس کے مقابلہ میں حافی اور اخلاقی ترقی کی رفتار سست ہے۔ لیکن اس کے ہرگز یہی معنی نہیں ہیں کہ یورپ کی اخلاقی یا روحانی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے۔ آجکل یورپ میں جو مذہبی لوگ ہیں وہ ازمنہ وسطی کے کلیسائی لوگوں سے بہتر عیسائی ہیں کیونکہ ایک طرف ان میں ذہنی شائستگی ہے تو دوسری طرف جمہوری تحریکات اور رجحانات کی وجہ سے ان میں معاشرتی خدمت گزاری کا جذبہ عام ہو گیا ہے۔ آجکل کا پادری تشکیلات کے رموز سمجھانے یا آخرت کی دہلیاں دینے کی بجائے خدمت خلق کی طرف زیادہ مائل ہے۔

یورپ کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہاں خود غرضی کی پیکا رہبت چھائی ہوئی ہے لیکن تاریخی لحاظ سے یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مختلف انسانوں کے گروہ مختلف انسانوں سے ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ یورپ کی ان مادی اور علمی ترقیوں کے بعد یہ امر بالکل ناگزیر تھا کہ پسماندہ اقوام خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں ان کے قبضہ اقتدار میں آجائیں۔

یہاں اس مغالطہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو خود اہل یورپ کو اپنے متعلق پیدا ہو گیا ہے کہ نسل کے اعتبار سے دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں انہیں فوقیت

حاصل ہے۔ یہ مغالطہ گذشتہ صدی میں پورے یورپ پر ایک یقین اور ایمان کی طرح طاری تھا۔ اس بت کے توڑنے میں سب سے پہلے جاپان نے پیش قدمی کی۔ جاپان کا روس کو شکست دینا ایک ملک کی شکست نہیں تھی بلکہ پوری ہندیب۔ جدید کی شکست تھی۔ لیکن یہ مغالطہ ابھی دور نہیں ہوا اور اب بھی مغرب میں کثرت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے ملک اور قوم میں اس مغالطہ کی پرورش کرنا اپنا بہترین فرض سمجھتے ہیں۔ مسوینی اور ہٹلر کا بہت کچھ دار و مدار اسی مغالطہ پر ہے۔ نیشے کے بعض شاگردوں نے اس کے فلسفہ کی غلط تعبیر کر کے اس خیال کو تقویت دے دی کہ ہم پہنچاؤ کی آمدہ مناد اور تقاریر میں فوق الانسان ہستیوں کی ایک نوع پیدا ہونے والی ہے۔ وہ سفید رنگ کے اقوام ہی سے ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی کے گھنڈ میں نسلی تفوق یا مغالطہ کا پیدا ہونا تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ عربوں کا جب اسلام کی قوت سے دنیا پر تسلط قائم ہوا تو بعض عرب مصنفین نے اہل فرنگ کے متعلق یہ لکھا تھا کہ سرد مالک کے لوگ سردی کی وجہ سے غبی ہو جاتے ہیں اس لئے علوم و فنون میں ان کو کبھی کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

مغرب کی ترقی کا ایک بڑا راز قومیت کا فروغ ہے۔ اس سے پہلے کبھی کوئی قوم بحیثیت قوم کے نہیں سوچتی تھی۔ رومن شہنشاہیت اور کلیسا کی قوت ٹوٹنے کے بعد یورپ کے مختلف گروہوں میں قومی اتحاد کا خیال پیدا ہوا چھوٹے گروہ بھی بحیثیت ایک قوم کے منظم ہوتے ہیں تو ان کو بڑی قوت حاصل ہو جاتی ہے ان گروہوں کو حب وطن کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں اس قدر کشمکش کرنی پڑی کہ ان کی تمام خفہ قوتیں بیدار ہو گئیں۔ یورپ کی جنگیں اور شدید تباہیاں

اسی حُب وطن کا نتیجہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی تمام ترقی بھی اسی جذبہ کی رہیں منت ہے۔ اسی جذبہ سے اب بھی قومیں اپنے آپ کو سنبھال رہی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی جذبہ یورپ کی خود کشی کا باعث ہو۔

۷ دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مال

موج مضطرب ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی

عورت | یورپ میں جنسی تعلقات پر اتنی شدید پابندیاں کبھی نہیں رہیں جتنی کہ اکثر مشرقی تہذیبوں میں ملتی ہیں وہاں جنسی تعلقات مشرق کی بہ نسبت بہت زیادہ آزاد رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پوپ جیسی برگزیہ ہستیوں نے بھی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھے اور ان کے اولاد بھی ہوئی۔ یورپ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ جہان کی خاطر تواضع میں گھر کی عورتوں کو پیش کرنا اچھے آداب و اطوار میں داخل تھا اور اس کا جا بجا رواج بھی تھا۔ آج سے دیر ۷۵ سال قبل کہ عورتیں علانیہ مارکٹ میں نیلام ہوتی تھیں اور بعض غلامدانی بیویوں کو سربازار نیلام کر دیتے تھے۔

یورپ میں جنسی بداعتدالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کلیسا تعدد ازواج کا حامی نہیں ہے۔ قانوناً اور مذہباً ایک سے زائد عورت سے شادی نہیں کی جاسکتی حالانکہ بعض حالات میں انسان ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ کلیسا کی ان ہی پابندیوں کی وجہ سے یورپ میں ناجائز جنسی تعلقات کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ باوجود ان ساری باتوں کے انیسویں صدی کے آخر تک عورتوں پر کچھ پابندیاں ضرور عائد تھیں اور کھل کھیلنے کا موقع عام نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب نے

عورتوں کو معاشی طور پر آزاد کرنا شروع کیا اور بڑی کثرت سے عورتیں اور مرد اپنے اپنے دیہاتی اور قصبائی ٹھکانوں سے اکھڑ گئے اور شہروں کے انجمن اور بے پہچان ہجوموں میں گھس کر سارے رسوم اور قیود سے آزاد ہو گئے۔ بڑے بڑے کارخانوں کے مزدور وادوں میں دور دور سے آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کے اختلاط نے جنسی بد اخلاقی کے تمام دروازے کھول دیئے۔ یہ اسی قسم کی صورت حال ہے جو بھٹی کے کارخانوں کے مزدوروں کے طرز ماند بود میں پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتوں کی ملازمت عام ہوتی گئی۔ جو عورتیں زندگی کے عام کاروبار میں بے تعلق مردوں کی ملازمت کرتی ہیں اور صبح سے شام تک انھیں رنگا رنگ کے مرد ہم کار ملتے ہیں تو پھر ان کے لئے اپنی عصمت کا بچانا ناممکن ہے۔ اللہ ماشاء اللہ۔

یہاں اسلام کی اس خوبی کو بیان کرنا ضروری ہے کہ فطرت کی جن قوتوں سے آپ سچکے نہیں نکل سکتے ہیں اسلام نے ان میں ایک تنظیم کی شکل پیدا کر دی ہے اور شتر مرغ بننے کی کبھی کوشش نہیں کی مثال کے طور پر مسلمانوں میں جو لونڈیوں کا رواج ہے اس کے متعلق اسلام نے خاص اصول و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ تعدد ازواج کی خاص اشکال ہیں جن سے بدکاری و زنا کاری کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باشوی ممالک میں عورتوں کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ چنانچہ روس میں اسلامی ممالک کی طرح چکے نہیں ہیں۔ مرد اور عورت آزاد ہیں۔ نکل و طلاق میں غیر معمولی سہولتیں ہیں۔

یورپ میں عورتوں کی آزادی کا تیسرا قدم جنگ عظیم ہے۔ مرد تو میدان جنگ میں

اور عورتوں نے ملک میں رہ کر آزادی حاصل کر لی۔ مردوں کا سارا کاروبار انھوں نے سنبھال لیا جس سے ان میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ ساتھ ہی جنسی تعلقات کثرت سے ناجائز پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ زمانہ جنگ میں جب فوجیں کسی حصہ پر قابض ہوتی تھیں تو وہاں کی عورتیں بڑی کثرت سے برضا و رغبت یا بالبحر فوجیہ کے ساتھ آلودہ ہو جاتی تھیں۔

عورتوں کی تقلید | مشرق کے لئے اب بڑا سوال یہ ہے کہ عورتوں کے مساوی حقوق تسلیم کرتے ہوئے ان کو زندگی کی جدوجہد کے غمگین شعبوں میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہوئے اور ان کی آزادانہ نشو و نما کے لئے ان کے راستہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے کیا طریق زندگی کرنا چاہیئے جس سے وہ خوبیاں تو حاصل ہو جائیں جو آزادی کے صحیح استعمال سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ خرابیاں پیدا ہوں جو یورپ میں نظر آتی ہیں آیا اس سلسلہ میں غذا و صفاغ کا ذکر ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا جواب آنے والے واقعات ہی دے سکیں گے۔ مغرب میں عورتوں کی بے تکام آزادی نے ایسے خوفناک نتائج پیدا کئے کہ مشرق والوں کے اس خیال کو تقویت ہو گئی کہ چاہے ہی عورتوں کے لئے سوز و درد کا مقام ہے۔ لیکن کوئی شخص بھی جو اپنی قوم کی حالت سے صحیح طور پر واقف ہے اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسمی پردے کا شدتوں نے نہ صرف عورتوں کو اپنا بچ کر دیا ہے بلکہ تمام جسد قومی اس سے مفلس ہو گیا ہے۔

قابل تقلید خصوصیات | مہذب یورپ کا عام انسان ہمارے ہموطنوں۔

مقابلہ میں بہت زیادہ محنتی اور بہت زیادہ فرض شناس ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں خصوصیت سے انگریز اور جرمن قوم بہت زیادہ قابل تعلید ہے۔ جرمنوں کی ایک عام قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اسے پایہ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ قومی ڈیپلن جتنا جرمنی میں پایا جاتا ہے اتنا دنیا کی کسی قوم میں شاید آج تک نہیں پایا گیا۔ ہر چیز کے لئے ایک قاعدہ اور قانون ہے۔ اور سوسائٹی کا نظام اس قسم کا ہے کہ ہر فرد کو قاعدہ کی پابندی کرنے کے بغیر چارہ نہیں ہے تمام زندگی زنجیر آئین میں جکڑی ہوئی ہے اور ہر فرد کو اس کا احساس ہے کہ آئین کی پابندی ہی سے افراد اور اقوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہو سکتی ہیں۔

ہندوستان کی ترقی کی پہلی منزل وہ ہوگی جبکہ ہندوستانیوں میں صحیح معنوں میں خُب وطن پیدا ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کے مختلف گروہ اپنی مذہبی و اقتصادی کشاکش کو چھوڑ کر ملک کی بہتری اور آزادی کے لئے کوشش کریں گے۔ اب تک اس ملک کی یہ حالت ہے کہ افراد یا تو اپنی انفرادی خود غرضی میں مبتلا ہیں یا مختلف گروہ فریقانہ تعصب کے شکار ہیں۔ جب تک یہ صورت حال باقی ہے اس ملک کی تمام قومیں باہمی کشاکش میں اسی طرح غارت ہوتی رہیں گی جس طرح ایک بڑی ندی ریگستان میں سے گزرتے ہوئے گم ہو جاتی ہے۔

یہ تمدن کا ایک عام اصول ہے کہ جب پسماندہ اقوام کا ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے تو پسماندہ قومیں پہلے ترقی یافتہ قوموں کے نظاں ہر اور ان کے عیوب کی نقل کرتی ہیں۔ ہماری قوم ابھی اسی منزل سے گزر رہی ہے۔ پرتار ان مغرب کا زیادہ تر گروہ ایسا ہے جو انگریزی کپڑوں، انگریزی طرز ماند و بود، انگریزی خوراک اور

اسی طرح بعض اور ظاہری چیزوں میں اہل یورپ کی تقلید کرنے کے بعد اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ امر بیان کرنا ضروری ہے کہ اہل مغرب نے پہلے علوم و فنون کو حاصل کیا اور اس کے بعد اپنی محنت اور اہل العزمی سے افزائش دولت کی طرف توجہ کی اور اپنی معیار زندگی اور رہائش کو ایک خاص سطح تک بلند کیا لیکن ہمارا مفلس اور پانچ ملک نے علوم و فنون کے حصول کی کوشش اور افزائش دولت کی جدوجہد کے بغیر دولت مند اقوام کی نقل شروع کر دی جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچا۔ اس لحاظ سے ہمارا گناہ دھی بے بڑا شاندار کام کیا کہ آزادی کی جدوجہد میں سادگی کو زندگی کی ضروری اساس قرار دیا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے جو اپنے دوسرے ہموطنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مفلس ہیں اور جن کو سادگی کی بہت زیادہ ضرورت ہے ابھی اس طرف توجہ نہیں کی۔

پیام پہلے مغرب کی دولت پیدا کرو، مغرب کی ہمت پیدا کرو، مغرب کا حب وطن پیدا کرو اور مغرب کا ذوق حریت پیدا کرو، اس کے بعد مادی آسائشیں خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔ گاڑی کو آگے اور گھوڑے کو پیچھے مت کرو۔ ان سب باتوں کے باوجود مشرقی انسان کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بڑی بڑی عظیم الشان تہذیبوں کا وارث ہے۔ زندگی کے اعلیٰ نصب العینوں کیلئے مشرقی انسان کو محض مغرب کا دریوزہ گر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس بات کو ضرورت ہے کہ وہ جھوٹے فخر سے مغرب کو ہمیشہ ہت دشنام بناتا ہے۔ مستقبل کی اٹل تہذیب وہ ہوگی جس میں مشرق کے بعض قدیم نصب العین مغرب کی کامیابیوں سے ہم آغوش رہیں گے۔

محترمہ صفراہایون مرزا

محترمہ صفراہایون مرزا آجیا حیدر آبادی خواتین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ شاعر ہیں، آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور متعدد دزنانی رسائل کی مدیرہ رہ چکی ہیں۔ آجکل رسالہ زیب النساء آپ کی ادارت میں لاہور سے نکل رہا ہے۔ آپ ایک اچھی مقررہ بھی ہیں اور حیدر آباد کی اکثر زبانی و مردانی کانفرنسوں میں آپ سرگرم حصہ لیتی ہیں۔ آپ سلسلہ میں اپنے مرحوم شوہر مشرہایون مرزا بیرسٹر کے ہمراہ سیاحت کی غرض سے یورپ تشریف لے گئی تھیں۔ اور دوسری مرتبہ ویسبلی نمائش کے دقت بھی آپ یورپ ہو آئی ہیں۔

اہل یورپ کی خصوصیات | محترمہ صفراہایون مرزا کے خیال میں یورپ کی ترقی کارانہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہر چیز میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے حوصلے بلند ہیں۔ وہ جس کام کو کرتے ہیں خلوص

اور محنت سے کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں اور ملک و قوم کے لئے ہر قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ برغلاف اس کے ہم گو کاہل ہیں۔ چاروی ہمتیں پست ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب ہم لا اِلهَ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر سید ہے جنت میں چلے جاسکتے ہیں تو ہمیں کسی اور کام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس فرسودہ خیالی نے ہمیں تباہ و برباد کر رکھا ہے۔

اہل یورپ وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں اور وقت کو بیکار ضائع نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ لنگڑے، لوے اور اپانچ سب ہی کام کرتے ہیں وہاں کے بیت المعذورین میں مختلف طریقوں سے ناکارہ لوگوں کو کام پر لگایا جاتا ہے۔ جرمنی میں غیر ملکی سیاحوں کے لئے ایک محکمہ قائم ہے جس کا کام سیاحوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیاح وہاں سے اچھے ارتساعات لیکر واپس جائیں تاکہ دور دور جرمنی کی شہرت پھیلے۔ اس محکمہ میں یہ بتلادینا کافی ہے کہ آپ جرمنی کی کونسی چیزیں دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بعد ہفتہ میں دو دن اس محکمہ کے صدر اور مستند آپ کو ان مقامات کی سیر کو لیجاتے ہیں۔ آپ کی سواری اور خور و نوش کا انتظام تک اس محکمہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ معتمدہ صغرا ہایون مرزانے اس محکمہ کے توسط سے بچوں کی تعلیم گاہیں، زرچگی خانے اور اپانچ خانے دیکھے۔ آپ اس محکمہ کے لوگوں کے اخلاق اور برتاؤ کی بڑی تعریف فرماتی ہیں۔

یورپ اور ہندوستان کی عورتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس مسلمان عورتوں سے کچھ کام نہیں لیا جاتا۔ جب تک

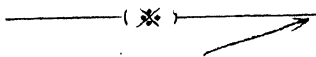
مرد اور عورت مل کر کوئی کام نہیں کر سکتے اس وقت تک ہمارا ترقی کرنا محال ہے۔ میرے اس اعتراض پر کہ اس سے گھر کے انتظامات میں مشکلات پیدا ہونے کا احتمال ہے آپ نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ گھر کا کام کلج سب سے مقدم لیکن کم از کم فرصت کے اوقات میں عورت اگر چاہے تو مرد کا بہت کچھ ہاتھ بٹا سکتی ہے لیکن آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کا یہ حال ہے کہ انھیں دعوتوں، تعایب اور جلسوں میں تو شریک ہونا آتا ہے لیکن نہیں آتا ہے تو گھر کا کام کلج۔ امورِ خانہ داری سے انھیں دلچسپی نہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ انھیں فرصت بھی نہیں۔ خود اپنی غیر معمولی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ نے فرمایا کہ گھر کے جملہ انتظامات اور پریشانیوں کے بعد وہ مضائقہ لکھنے، تعادیر کرنے، کانفرنسوں اور جلسوں میں شریک ہونے کے لئے وقت نکالتی ہیں۔ آپ کے خیال کے بموجب انسان اگر کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں کام کا یہ عالم ہے کہ زرعی خانوں میں زچاؤں کو بھی بیکار نہیں چھوڑا جاتا۔ وہاں کے معذوین سے جو کام لیا جاتا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ نہیں ہے تو اسے پاؤں یا دانتوں سے لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ کوئی گونگا بھرا ہو تو اسے باغبانی سکھائی جاتی ہے۔ جرمنی کے ایک بیت المعذوین میں آپ نے دیکھا کہ ایک کرے میں ان تمام پاجوں کی تصویریں آویزاں تھیں جنہوں نے باوجود بدترین جسمانی ناقابلیتوں کے کچھ نہ کچھ کام سکھایا اور اس میں ترقی کی۔ اس سے دوسرے پاجوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور ان کے دلوں سے یہ خیال جاتا رہتا ہے کہ دنیا میں ان کی ہستی کسی مصرف ہی کی نہیں اور وہ سراسی کے ناکارہ افراد ہیں۔

پردہ [ہندوستان کی ملان عورتوں میں آجکل جس قسم کے پردے کا رواج ہے اس میں محترمہ صغرا ہالوں مرزا تیریم کی ضرورت محسوس کرتی ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ ہماری عورتوں کو اسلامی پردہ اختیار کرنا چاہیے جس سے زندگی کے کاروبار میں بہرہ واقع نہ ہو۔ آپ بے پردگی کی حامی نہیں ہیں لیکن آپ چاہتی ہیں کہ عورتوں کا لباس ستر پوش ہو۔ اور عورتیں برقع ہی پہن کر کاروبار میں حصہ لیں۔

میرے اس سوال پر کہ ہماری عورتیں یورپ کی عورتوں کی کس حد تک متبع کر سکتی ہیں آپ نے فرمایا کہ ہمیں ان کی اچھی اچھی چیزیں اختیار کرنی چاہیے۔ یورپ کی سب ہی عورتیں بری نہیں ہیں۔ اچھے اور برے نمونے ہر ملک میں ہوتے ہیں اور ہم کو اچھوں کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں آپ نے اپنی کسی زمانہ کی ایک یورپین ٹیوشن سنٹر گھوش کا ذکر فرمایا جو باوجود نا تجربہ کار، جوان اور حسین ہونے کے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر کے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ وہ پردہ تو نہیں کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ ملازم لڑکا کمرے میں گھس آئے یا شوہر کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی دوست گھر آجائے۔ برنٹلات اس کے ہمارا نیم پردہ ہمارے لئے خطرہ جان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کی عصمت بآبی کا امتحان اس کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک جانور کو بھی باندھ کر رکھا جائے تو اس سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوگی۔ اصل آزمائش باہر پھرنے والیوں کے لئے ہے کہ باوجود موقعوں اور دلچسپیوں کے ان کے ہاتھ سے عصمت کا دامن نہیں چھوٹتا۔

خاتمہ [آخر میں محترمہ صغرا ہالوں مرزا نے فرمایا کہ ہماری عورتوں کی غیر ترقی یافتہ

حالت کے مدد بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ خود مردوں کو چاہیے کہ اپنی عورتوں کو کام پر لگائیں۔ اُن کو ایسے کام سکھائیں کہ اپنی فرصت کے اوقات میں وہ مصروف رہ سکیں۔ اُن کو دنیا کے حالات سے باخبر رکھا جائے۔ اخبار پینے کی اُن میں عادت ڈالی جائے۔ اُن میں وطنیت کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ ان میں وسیع النظری پیدا کی جائے تاکہ وہ شیعہ، سنی، ہندو، پارسی یا عیسائی کی تفریقوں کو نظر انداز کر کے قومی ترقی کا خیال رکھیں۔ ہماری ماؤں کو چاہیے کہ گہوارہ ہی سے بچوں کے دلوں میں محبت اور صلح و آشتی کے بیج بوئیں تاکہ آئندہ چلکر جب یہ بیج تناور درختوں کی شکل اختیار کریں تو ہزار تفرقوں کی آندھیاں چلیں لیکن یہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکیں



سب سے زیادہ ڈنمارک، سکاٹلینڈ اور سویڈن جیسا کہ
اس بٹری صیحا کا ہے

مولوی میر اکبر علی خان حسنا

(*)

مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ آنرز (لندن)
 بیرسٹراٹ لالک کے مشہور رلیڈر اور جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر پتوت ہیں۔
 انجمن مجلسائین عثمانیہ کے صدر کی حیثیت سے آپ نے دو تین سال ملک
 کی اس نوجوان جماعت کی بہترین سرکردگی فرمائی ہے۔ آپ مجلس وضع قوانین
 سرکار عالی کے رکن اور مجلس بلدیہ کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آپ اینکار
 کیٹی کے بھی رکن ہیں جس کو حکومت سرکار عالی نے ملک کی سیاسی و دستوری
 اصلاحات کے متعلق سفارشات کرنے کا حق فرمایا ہے۔
 آپ کا قیام انگلستان میں ۲۵ سالہ ہے۔

خصوصیات | انگلستان کی سب سے پہلی چیز جو ایک نووارد کو متحیر کرتی ہے
 وہ لوگوں کی مصروفیت ہے۔ آپ کسی روز صبح کام کے اوقات
 شروع ہونے سے قبل سڑک پر نظر دوڑائیں تو اندازہ ہو گا کہ کس طرح ہر شخص اپنی جگہ

لگا ہوا ہے اور وقت کے سیلاب کے ساتھ بہا جا رہا ہے۔ اس گڑبڑ اور نفسی نفسی میں جو چیز قابل تعریف ہے وہ لوگوں میں انتہائی ضبط و نظم کا پایا جاتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو اپنے اور دوسروں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس ہے۔

ضبط و نظم میرے اس سوال پر کہ اہل فرنگ میں اس ضبط و نظم کی کیا وجہ ہے اور یہ چیزیں ہم میں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں مولوی اکبر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ یہ چیزیں تعلیم سے زیادہ تربیت کا نتیجہ ہیں۔ ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے یہ عادتیں اتنی راسخ ہو گئی ہیں کہ اب یہ قومی خصوصیات میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے خیالات اور احساسات زبانی جمع و خراج کی حد تک تو بہت اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں لیکن عمل نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت بالکل تصوری ہوتی ہے۔

ایتیار انگریزوں کے متعلق یہ کہنا مبالغ نہ ہو گا کہ وہ مجسم ایتیار اور ہمدردی ہیں۔ اسکی توضیح آپ نے اپنے ایک معمولی تجربہ سے یوں فرمائی۔ آئرس کے آخری امتحان کے دو تین روز قبل آپ کا مزاج نا ساز ہو گیا۔ آپ سخت متروک تھے کہ کیا ہو گا لیکن لینڈ لینڈی نے آپ کی تیمارداری اور دلدہی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ وہ روزانہ امتحان گاہ تک آپ کے ساتھ آتی اور پرچہ ختم ہونے تک باہر سڑکیں بیٹھی رہتی اور آپ کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے سیوہ جات اور کھانے کی دوسری ہلکی چیزیں بھیجتی رہتی۔ امتحان کے اختتام تک اس کا یہی حال تھا بلکہ اس نے اپنے شوہر سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس نے اپنا سارا وقت مسخرخان کے لئے وقف کر دیا ہے۔ بر خلاف اس کے ہمارے پاس موقع و محل کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ جہاں ضرورت نہیں وہاں ہمدردی کا اتنا مظاہرہ ہوتا ہے کہ تکلیف ہونے لگتی ہے اور جہاں فی الواقع اس کی ضرورت

ہوتی ہے وہاں سردہری برتی جاتی ہے۔

ضبط و تحمل | انگریزوں کے ضبط و تحمل کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک تہہ مولوی اکبر علی خاں صاحب اپنی لینڈ لیڈی کے ہمراہ برائٹن تفریح کے لئے گئے اور اس عورت کے شوہر نے وہاں سیکل پر آنے کا وعدہ کیا۔ لیکن چالیس پچاس میل کا فاصلہ ہونے کی وجہ سے یہ شخص وہاں دیر سے پہنچا اور مقام متعینہ پر ان لوگوں کو منتظر نہیں پایا۔ ملاوہ ازیں مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کا پتہ بھی نہیں چل سکا۔ اس کو وہاں کسی ہٹل میں ٹھہرنے بھی جگہ نہیں ملی۔ ناچار کو فٹ کھا کر وہ مکان واپس ہو گیا۔

دوسرے روز جب یہ لوگ واپس ہوئے تو راستہ میں ایک دوست کی زبانی سکی 'ینوں اور غصہ کا حال معلوم ہوا۔ مکان پہنچنے کے بعد بیوی نے اپنی غلطی کی معذرت دی۔ شوہر نے نیچی نظریں کئے ہوئے جواب دیا کہ آئندہ کے لئے احتیاط کی جائے۔ اراقتہ ختم ہو گیا ورنہ مولوی اکبر علی خاں صاحب دل میں ڈر رہے تھے کہ ہم نہیں دونوں کی لڑائی کیا صورت اختیار کرتی۔

لمزوریاں | انگلستان کے لوگوں میں بظاہر دو خامیاں نظر آتی ہیں۔ ایک جذبات کی کمی اور دوسرے عورتوں کے معاملات۔ اول الذکر

صبر و روبری ذہنیت کا نتیجہ ہے جس نے لوگوں کو حد درجہ کاروباری بنا دیا ہے۔ سرکہ ممکن ہے کسی اپاہج کو خیرات دیتے ہوئے لوگ پس و پیش کریں لیکن اس برکزیہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ان میں خیرات کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس معاملہ میں یہ لوگ ہم سے بھی زیادہ پابندی میں لیکن انفرادی خیرات کے طریقوں کے مخالف ہیں۔

ڈاکٹر محمد مقبول علی

(فندن)
ڈاکٹر محمد مقبول علی بی۔ اے۔ یل۔ آر۔ سی۔ پی۔ ایم۔ آر۔ سی۔ بیس
جامعہ عثمانیہ کے پہلے فلسفاتی ہیں جنہوں نے انگلستان سے طب کی
ڈگری حاصل کی۔ آپ سررشتہ طبابت سرکار عالی میں سیول
سرجن ہیں۔

سنہ ۱۲۸۵ میں آپ علیگڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ جب رئیس الاحرار
مولانا محمد علی رح نے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تو آپ اس میں شریک ہو گئے
اس طرح آپ کو مولانا کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔
تحریک خلافت کے زمانہ میں صوبہ سرحدی و صوبہ متوسطیہ میں پروگرنڈ
کا کام آپ کے فغویض تھا۔

انگلستان میں آپ کا تیسرا سال ۱۲۸۵ تا ۱۲۸۶ء رہا

تنظیم ابتدا میں جب ایک ہندوستانی طالب علم انگلستان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی کیفیت بالکل ایک رنگ روٹ کی سی رہتی ہے۔ اس کا ماحول نیا ہوتا ہے۔ اس کے لئے دنیا نئی ہوتی ہے اور ہر چیز نئی۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے واقف ہونے کے لئے اسے کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ اپنے اس ابتدائی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کو جس چیز نے سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا وہ بس اسٹانڈ کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی لیکن بس کے انتہا میں لوگ برساتیاں اوڑھے یا چھتری لگائے قطار (کیو) باندھے کھڑے تھے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے بس آتی تھی، کنڈکڑ خالی نشستوں کی تعداد بتلا دیتا تھا اور سلسلہ کے لحاظ سے اتنے ہی لوگ بس میں داخل ہو جاتے تھے۔ انگریزوں کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہی ان کا ضبط و تنظیم ہے جو ان کی زندگی کی ہر چیز پر حاوی ہے۔

محنت کی قدر اسی طرح لوگ اصول کے بڑے پابند ہوتے ہیں، اوقات کی پابندی کرتے ہیں اور خوب محنت کرتے ہیں۔ کام کرنے کے شوق کا یہ عالم ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتا ہے خواہ اس میں آمدنی کی کوئی صورت ہو یا نہ ہو۔ اپنے ایک واقعہ کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے اس کی یوں توضیح فرمائی۔ لندن کے جس ہسپتال میں آپ زیر تعلیم تھے وہاں دو ادھیڑ عمر کی نرسیں بیماریوں کی پالکیاں اٹھایا کرتی تھیں اور آپریشن گھنٹی کی صفائی بھی ان ہی کے ذمہ تھی۔ یہ دونوں وقت کی بڑی پابند تھیں اور اپنا کام بہت ہی عمدگی سے انجام دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے ایک ہمدردانہ چہرے

ان کی غیر معمولی محنت کی تائش کرتے ہوئے ان کا مشاہرہ دریافت فرمایا۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوا کہ انھیں ہسپتال سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں ملتا اور وہ جو بھی کام کرتی ہیں وہ محض شوق، وقت گزاری اور جذبہ ایثار کے تحت کرتی ہیں۔

اسی طرح شاہ جاج پنجم آنجنائی کی ہمیشہ کا بھی ایک واقعہ ہے جو لندن کے ایک بچوں کے ہسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھیں۔ ابتداء ہسپتال والوں نے اُن سے ایسا کام لیا جو اُن کے اعزاز کے لحاظ سے مناسب ہو سکتا تھا لیکن جب اس کا انھیں پتہ چل گیا تو اس کو اُنہوں نے منظور نہیں فرمایا اور دوسرے روز سے ایک نرس کی حقیقی خدمات انجام دینے لگیں جس میں فرش کا دھونا بھی داخل ہے۔ مذکورہ دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگلستان میں محنت کی کیسی قدر کی جاتی ہے اور کام سے لگے رہنے کے کیا معنی ہیں۔

ہسپتال | شہر لندن میں بارہ پندرہ بڑے بڑے ہسپتال ہیں جہاں طبی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ یہ ہسپتال بالکل چندوں اور عطیوں پر قائم ہیں جن سے انگریزوں کی بیدار مغزی ظاہر ہوتی ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی کچھ رقمی امداد مل جاتی ہے جو بہت قلیل ہوتی ہے۔ ان ہسپتالوں میں جتنے ڈاکٹر کام کرتے ہیں انھیں کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی۔ البتہ طبی جماعتوں کو پڑھانے کا برائے نام کچھ معاوضہ مل جاتا ہے۔ لیکن ہسپتال میں مفت کام کرنے کے یہ معنی نہیں کہ انھیں کچھ فائدہ پہنچتا ہی نہیں ان کی خانگی پریکٹس کا دار و مدار اسی اعزازی خدمت پر ہے اور یہیں سے اُنہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔

ہر محلہ میں پینل پریکٹس کا طریقہ رائج ہے جس میں کم قیمت کی دواؤں سے

غربا کا علاج کیا جاتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو انگلستان میں ڈاکٹر بڑے ہنگامے میں اُن سے ملنے کے لئے اوقات مقرر ہیں۔ مشورے کی فیس کم از کم دو پونڈ یا تیس روپیوں کے قریب ہوتی ہے۔

عورت | یورپ کی عورتوں کے متعلق مشرق میں عجیب و غریب قصے شہور ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہاں عورتوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگر وہی بات ہندوستان میں پیدا ہو جائے تو یہاں حالات اور بھی بدتر ہو جائیں۔ یورپ میں باوجود اتنی آزادی کے آپ بغیر متعارف ہوئے کسی عورت سے ملاقات یا گفتگو نہیں کر سکتے۔ اکثر عورتوں سے باوجود شناسائی کے اختلاط نہیں بڑھایا جاسکتا جب تک وہ خود اس پر رضا مند نہوں۔ عورتیں عام طور پر خوش طبعی اور بدلہ سنجی کو بہت پسند کرتی ہیں اور ایسے لوگ عورتوں میں کافی مقبول رہتے ہیں۔ علاوہ انہیں ہر اُس شخص کی قدر کی جاتی ہے جس میں کچھ نہ کچھ کمال ہو۔

فرانسیسی عورتیں اخلاقی معیار میں انگریزی عورتوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ وہاں سربراہ ہائیڈ پارک کے جیسے اختلاط کے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے البتہ امریکہ کے خوش باشوں یا دیگر سیاحوں کے لئے عورتوں کا ایک خاص طبقہ موجود ہے۔

نسلی امتیاز | انگلستان میں حاکم و محکوم اور کالے گورے کا بھی امتیاز ہوٹل میں ایک نئے آنے والے حیدر آبادی صاحب کے لئے ایک کمرہ محفوظ کرایا لیکن جب ہوٹل کے مالک کو اُن کی قومیت معلوم ہوئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ انگریزوں کی یہ خصوصیت ہے کہ کیس طرح اپنا کام نکالنے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن جہاں اُن سے کوئی کام نکلنا ہو یا جب مساویانہ سلوک کا موقع آئے تو کتر جاتے ہیں۔

عام اخلاق | انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ بہت ذی خلق ہوتے ہیں۔ ہسپتال کا بڑے سے بڑا سرجن معمولی سے معمولی مریضوں کے ساتھ انتہائی خندہ پیشانی سے گفتگو کرتا ہے۔ مریضوں کے جوتے خود اپنے ہاتھوں سے اتارنے اور پہنانے میں بھی اسے عار نہیں ہوتا۔ اسی طرح چھوٹے درجہ کے لوگ بھی خلیق ہوتے ہیں لیکن ان میں متضاد مثالیں بھی لمباتی ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کرائڈن تشریف لے گئے اور سگریٹ پیتے ہوئے اس مقام کا گشت نگار ہے تھے جہاں پر ہوائی جہاز ٹھہرے ہوئے تھے آپ کو سگریٹ پتیادیکھ کر ایک معمولی قسم کے آدمی نے جو غالباً وہاں کا نگران تھا آپ سے مخاطب ہو کر کہا ”جناب! اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہاں سگریٹ نہیں پتیا؟“ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کو سگریٹ پینے سے منع کرنے کا اس سے بہتر اور موثر طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے اخلاق وہاں کی سوسائٹی میں عام طور پر برتے جاتے ہیں۔

جذبات ایشار | انگریزوں میں ایشار و ہمدردی کا بھی بڑا مادہ ہے۔ اگر کوئی حادثہ ہو جائے یا کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو لوگ ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خود ہندوستان کے مشہور قتل باولا کے واقعہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ کس طرح دو انگریز عہدہ داروں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر

باؤلا کی دستگیری کی تھی۔ بہر کیف ہندوستان اور انگلستان کے حالات کا
مقابلہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں کتنے کی جان کی جتنی قدر کی جاتی
ہے اتنی یہاں انسان کی نہیں کی جاتی۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خان

(آکسن)

ڈاکٹر میر سیادت علی خان ایم۔ اے پی۔ پیچ، ڈی، بی، سی، ال

بیرسٹراٹ لاجا معہ عثمانیہ کی ایک بہترین پیداوار ہیں۔ آپ سررشتہ عدالت

سرکار عالی میں ناظم ضلع ہیں۔ اس کے قبل آپ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ قانون

میں پروفیسر تھے۔ شرع شریف اور اصول فقہ آپ کے خاص مضامین ہیں

انگلستان میں آپ کا قیام ۱۲۶۶ھ تا ۱۲۷۱ھ رہا۔

تفہیم | یورپ کے عروج کا راز ڈاکٹر میر سیادت علی خاں کے نزدیک صرف
ایک لفظ ”تفہیم“ میں مضمر ہے جو اہل یورپ کی زندگی کے ہر پہلو
پر حاوی ہے۔ صرف ایک طریقہ ”کیو“ سے اہل فرنگ کی باقاعدگی، تفہیم
اور فرض شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے کسی سینما گھر، کسی تفریح گاہ اور ایسی طرح
کسی عام مقام پر کسی قسم کا شور یا ہنگامہ نظر نہیں آتا۔ لوگ تطاریں باندھے کمرے
رہتے ہیں اور باری باری سے ٹکٹ حاصل کرتے ہیں۔ ریل چھوٹ جائے،
سینا دیکھنا نصیب نہ ہو، سیر و تفریح سے محروم ہو جائیں لیکن ”کیو“ کی پابندی

لازم ہے۔ یہاں کی طرح نہیں کہ سینا دیکھنے جتنے لوگ جاتے ہیں وہ بیک وقت ٹکٹ خریدنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس میں کسی کا دم کیوں نہ ٹکٹ جائے۔

کاروباری ذہنیت | وقت کی پابندی ایسا ہے عہد اور فرض شناسی وہاں کی زندگی کے عام اصول ہیں۔ صنعتی ملک ہونے کی وجہ سے لوگوں میں یہ عادتیں راسخ بھی ہو گئی ہیں۔ اس کاروباری ذہنیت کا یہ اثر ہے کہ لوگ بے حد خلیق، ہمدرد اور وسیع النظر ہیں۔ کسی معاملہ میں واردی اور جلد بازی نظر نہیں آتی اور بڑے سے بڑے معاملہ میں لوگ کبھی الجھتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ چیزیں وہاں کے معمولی سے معمولی لوگوں میں پائی جاتی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب برٹش میوزیم میں پانچ سات گھنٹے مطالعہ کر کے ایک بس اسٹانڈ کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک بس (موٹر) آ رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس کے پیچ راستہ میں تھے۔ ڈرائیور ہارن پر ہارن بجا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس خیال میں تھے کہ وہ کھرچے (پیو منٹ) پر چل رہے ہیں لہذا انہوں نے ہارن پر کوئی توجہ نہیں کی۔ بالآخر بس بری طرح آپ کے سامنے آ کر دکی اور اس کا ٹکڑا ڈو آپ کی پیٹلون کو چاٹ کر رہ گیا اس وقت کہیں ڈاکٹر صاحب اپنے مراقبہ سے بیدار ہوئے۔ پریشانی میں ڈرائیور کی صورت پر جو آپ نے نظر ڈالی تو وہاں بجز مسکراہٹ کے کچھ نہ تھا۔

پابندی وقت | وقت کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ معمولی دودھ لانے والا روز آٹھ صبح اپنے وقت پر اس پابندی سے آتا ہے کہ

آپ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑی کا وقت درست کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور واقعہ بیان فرمایا۔ آپ کو حیدر آباد ہی سے رات میں سونے سے قبل پیالی بھر دودھ پینے کی عادت تھی۔ چنانچہ انگلستان پہنچنے کے بعد آپ نے اپنی لینڈ لیڈی کو اس کے متعلق ہدایت کر دی۔ لیکن اپنے پانچ سالہ قیام میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ بھی دودھ کو ناغہ نہیں پایا۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی غیر معمولی پابندی تو ماں بہنوں سے بھی ممکن نہیں۔ انگلستان کے ادنیٰ ملازمین کے معیار کارکردگی، راست بازی اور فرض شناسی کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہاں محنت کتنی باہمارت ہے جس نے وہاں کی زندگی کو جنت بنا دیا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں یہی چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یہاں تو معمولی ماماؤں کا ملنا محال ہے اور پھر ان کی ناز برداریاں۔ خدا کی پناہ!

تربیت اطفال | تربیت اطفال کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ میں تعلیم پانے والے چھوٹی عمر کے بچوں کے عام معلومات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ سائنس، ایجادات اور دوسری کارآمد چیزوں سے متعلق بچوں کو جو معلومات گھر میں کھیل کود کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں وہ ہمارے پاس کے بڑی عمر کے سائنس پڑھنے والوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اس طرح ملک کی تاریخ، جغرافیہ، سیاست، انتخابات، سائنس کے مبادی، ملک کی پیداوار، پھول، پودے اور پرندوں سے متعلق سوئی سوئی باتیں اور ان کے نام بچوں کی نوک زبان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آکسفورڈ کی ایک فیملی میں سات آٹھ ماہ سے مقیم تھے۔

کرسمس میں اپنی لینڈلیدی کے چودہ سالہ لڑکے کو آپ کچھ تحفہ دینا چاہتے تھے جو وہاں کا ایک عام طریقہ ہے۔ آپ نے اس لڑکے سے دریافت کیا کہ اُسے کونسی چیز دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار کرنے پر اُس نے جواب دیا کہ آپ صرف پانچ شلنگ دیئے جائیں کیونکہ اپنے دائرہ سٹ کے لئے جو خود اس نے تیار کیا ہے ایک پرزہ کی ضرورت ہے جس کی قیمت پانچ شلنگ ہے اور اس رقم کے دینے میں اس کی ماں کو ایک زمانہ سے تامل ہے۔ چنانچہ اس رقم سے اس لڑکے نے نہ صرف اپنا سٹ ہی مکمل کیا بلکہ گھر کے سب لوگ اس عید کے موقع پر دائرہ سٹ سے لطف اندوز بھی ہوئے۔

عورت | انگلستان کی عورتوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ زندگی کی دوڑ میں یہ مرد کے دوش بدوش ہیں گھر کا انتظام کفایت شعاری اور سلیقہ ان کے فرائض کے اہم جزو ہیں۔ شوہر کی آسائش کے معاملہ میں بھی مغربی عورت ہمارے معیار تہذیب پر پوری اُترتی ہے البتہ وفاداری اور محبت مآبی کے متعلق ان کا تصور کچھ ہم سے مختلف ہے۔ لیکن مغرب کی ہر عورت کے متعلق عمومیت سے اس نظریہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اچھے اور برے نمونے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ تربیت، احوال، معاشی و اقتصادی حالات اور خاندانی شرافت کا بھی اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

عورت کی حیثیت قانونی | انگلستان میں ایک زمانہ وہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے لیکن لاڈ برکن ہیڈ ایکٹ کے بعد سے عورت کی

حیثیت قانونی میں بڑا ارضا نہ ہو گیا ہے۔ انگلستان میں شادی نہ صرف مذہبی بندھن ہے بلکہ دیوانی معاہدہ بھی۔ قوانین شادی اچھے ہیں اور شوہر بیوی کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ لیکن طلاق کے معاملہ میں اب بھی فریقین کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر طبیعتوں کا اختلاف، شوہر کا ظلم اور دباوتی بیوی کا بانجھ پن یا خرابی صحت حصول طلاق کے لئے کافی وجوہات تسلیم نہیں کئے جاتے۔ طلاق کے لئے زنا کا ثابت کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ طلاق حاصل کرنے کے بعد بیوی نہ صرف شوہر سے اپنا نفقہ حاصل کرتی ہے بلکہ اپنے نکاح ثانی کے بعد بھی وہ نفقہ کی مقدار ہوتی ہے۔

وصیت وصیت کے معاملہ میں بھی سروسی پر کوئی قانونی تحدید نہیں ہے وہ جتنی چاہے جائداد وصیت کے ذریعہ منتقل

کر سکتا ہے۔ لیکن قابل تعریف بات یہ ہے کہ وصیت کرنا لوگوں کی عادت میں داخل ہو گیا ہے۔ شرع مشرعیف میں بھی اپنے اعمال کی غامیوں کو وصیت کے ذریعہ پورا کرنے کا حکم ہے لیکن انگلستان میں حقیقی معنوں میں اس حکم کا منشا و پورا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس عام طور پر جیتے جی وصیت کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور جب تک موت سر پر نہیں پہنچ جاتی وصیت کی طرف ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وصیت کرنے کا موقع بالعموم ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ وصیت کی طرح وہاں ہر شخص مادہ تا اپنی زندگی کا بیمہ بھی کرواتا ہے۔

قومی خصوصیات اس میں شک نہیں کہ اسلامی یا مشرقی نقطہ نظر سے یورپ اور انگلستان کی اخلاقی حالت پست ہے۔ شراب خواری

عصمت فردوشی اور اس قسم کے دو سرے عیوب وہاں بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اہل فرنگ میں بعض قومی خصوصیات ایسی موجود ہیں کہ ان کی برائیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچنے کے بعد ممکن ہے مسلمانوں کی پستی اور نکبت کا سبب بنی عباس اور بنی امیہ یا دیگر قبائل کے خاندانی مناقشات و باہمی منافرت ہو لیکن سب سے زیادہ مسلمان حکمرانوں کو جس چیرنے تباہ کیا وہ انہی عیش پرستی تھی اور اس میں بھی ان لوگوں نے اتنا غلو کیا کہ امور سلطنت کو پیش ڈال دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یورپ کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ باوجود اس کے کہ یورپ میں شراب خواری و عصمت فردوشی کی کثرت ہے لیکن لرگ اصول کے اتنے پابند ہیں کہ ہر کام وقت پر کرتے ہیں۔ دن بھر کے کام کلج کے بعد لوگ رات میں خوب عیش مناتے ہیں اور یورپ میں اس کے بے حد مواقع بھی حاصل ہیں لیکن صبح دیکھئے وہ اپنے کام پر برابر حاضر ہیں اور اپنا کام اس مستعدی اور دلجمعی سے انجام دیتے ہیں کہ اس وقت ان کے دماغ میں عیش کا کوئی تصور بھی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان

ڈاکٹر یوسف حسین خان بی۔ لٹ (پیرس) جامعہ عثمانیہ میں تاریخ
ہند کے اساتذہ ہیں۔ آپ نے جامعہ قیہ دہلی سے اپنا طیلان حاصل کیا ہے۔
ایک سرخ، اکویب اور مقرر کی حیثیت سے آپ بے حد مشہور ہیں۔ آپ کی
انگریزی کتاب ”نظام الملک آصف اول“ تاریخی نقطہ نظر سے حضرت آصف اولؒ
کی بہترین سوانح ہے۔

آپ کا قیام فرائس میں ۱۳۴۷ تا ۱۳۴۸ء رہا۔

پورپ کی برتری کے اسباب | ڈاکٹر یوسف حسین خان کا ذاتی خیال یہ ہے
کہ کسی قوم کی برتری کے دو اسباب
ہوتے ہیں: (۱) خود اس قوم کی اجتماعی تنظیم (۲) اس قوم کی وہ صلاحیت جو کائنات
اور فطرت کو تسخیر کرنے کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہے۔ باوجود اپنی کمزوریوں
کے یورپ کا نظام اجتماعی دنیا کے دوسرے نظامات اجتماعی سے برتر ہے اور اس کا
اصل اصول حریت — انفرادی حریت ہے۔ ازمنہ وسط کی تاریکی سے نکلنے کے

بعد ہی آزادی اور حریت تھی جس کی بدولت اہل یورپ کے دماغ روشن ہوئے، رسوم اور توہمات کی بیڑیاں اسی کی ادھار سے کافی نگینیں اور فلسفہ اور سائنس کے حقائق اسی کی بدولت دنیا کے سامنے بے نقاب ہوئے۔ یہ آزادی سیاسی آزادی نہیں بلکہ عقل انسانی کی آزادی ہے جس سے اہل یورپ نے ایک بہتر اجتماعی تنظیم کی داغ بیل ڈالی جس میں مساوات، عدل و انصاف اور ہر اس شخص کو جو صلاحیت رکھتا ہو اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ مغربی یورپ میں پچھلے تین سو سال میں صد ہا ایسی مثالیں ملینگی کہ ادنیٰ بلکہ اسفل طبقہ کے لوگوں نے علم طب، فلسفہ، ادب اور دیگر میدانوں میں دوسروں کی رہنمائی کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ موقع افراد کو اسی وقت ملتا ہے جب ان کی اجتماعی تنظیم کا محرک عدل و مساوات ہو۔ مسلمانوں نے دنیا کو جو تمدن دیا تھا اس کی خصوصیات بھی ان کی اجتماعی تنظیم کی برتری تھی جس کی وجہ سے افراد کو اپنی قابلیت چکانے کا موقع ملتا تھا اور وہ قوم اور ملک کا بڑے سے بڑا کام کر سکتے تھے۔ اسی اجتماعی تنظیم کے بگڑنے سے نہیں زوال آیا اور علم و فن کی مشعل ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو اب ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ پورے طور پر مساوات کئی یورپ میں بھی موجود نہیں ہے لیکن کم از کم فرانس اور انگلستان میں اس کا امکان ہے کہ ایک ادنیٰ طبقہ کا فرد اگر اس میں صلاحیت ہے تو وہ وزیر اعظم تک بن سکتا ہے۔ بغیر اس اجتماعی تنظیم کے انفرادی قابلیت بڑے کار نہیں آتی کیونکہ اس کے چشمے گھٹ کر رہ جاتے ہیں اور ان کو فروغ دینے والی محرکات فنا ہو جاتے ہیں۔

یورپ کی بہتری کا دوسرا سبب تسخیر فطرت کی صلاحیت ہے گزشتہ دو تین سو سال میں سائنس نے یورپ میں خاص اہمیت حاصل کی ہے اور اس کی ابتدا وہاں سے کی گئی جہاں پر کہ مسلمانوں نے اس کو اپنے عروج کے زمانہ میں لا کر چھوڑا تھا۔ یہ دراصل اجتماعی قابلیت ہے کہ فطرت کے دالہ سے سرسبز معلوم کر کے اور ان پر قابو پا کر انہیں اپنے فروغ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ اجتماعی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ نہ صرف تمدن کو بہتر اور اعلیٰ بناتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علم اور فن کے پوشیدہ رازوں کو بھی آشکار کرتی ہے اور فطرت کے یہی راز ہائے سرسبز جب اجتماعی ملک بن جاتے ہیں تو بجائے خود تمدن کو فروغ دیتے ہیں۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اہل یورپ کی نظم و ترتیب اور ضبط اجتماعی کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے افراد کو اس لئے کہ فروغی دراصل زندگی میں سب کچھ ہے اور جماعت بھی اس کے بغیر کچھ نہیں، آزاد کیا اور جب ذہن انسانی آزاد ہے تو وہ لامتناہی ہے۔ فطرت کا کوئی راز اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ وہ فطرت کو اسی طرح اپنا غلام بنا لیتا ہے جس طرح ادنیٰ تمدنوں میں انسان اپنے ہم جنسوں کو غلام بناتے ہیں بجائے اس کے کہ آدمی اس کی گاڑی کو کھینچیں وہ فطری قوت سے اپنی گاڑی کچھواتا ہے۔

یورپ کی سائنس فک ترقی جس کے مظاہرے سے ہم اس قدر مرعوب ہیں وہ دراصل ذہن انسانی کی آزادی کا نتیجہ ہے۔ سائنس کے مظاہر کو تباہی کے لئے بھی اور تمدن کی ترقی کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ بجائے خود

علوم طبعیہ کا مقصد یہی ہے کہ فطرت پر انسان کی گرفت اور قابو کو مستحکم کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ نہایت شاندار اور نہایت ہی قابل قدر مقصد ہے کیونکہ اس کے مد نظر انسانی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن اگر انسان چاہیں تو ان ہی مظاہر کو ایک دوسرے کی تباہی کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں جیسا جنگ عظیم میں ہوا لیکن سائنس کا قصور نہیں بلکہ نفس انسانی کا قصور ہے جو سائنس کو اعلیٰ مقاصد کی بجائے ادنیٰ مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ غرض یہ ذہن انسانی کی کار فرمائی ہے کہ آج ہمیں زمین، پانی اور ہوا پر انسانی تسلط نظر آرہا ہے اور انسان کی ہی وہ قوت ہے جس نے پہاڑوں کے جگر شق کر دیئے، سمندروں کو عبور کیا اور بجز زمانی و مکانی کوتاہیوں کے۔

ترقی کا مفہوم | میرے اس سوال پر کہ آیا ہمارے نظام معاشرت میں کوئی ایسی خامیاں ہیں کہ ہم ان کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتے

اور کیا اہل یورپ کی خانگی اور اخلاقی زندگی خصوصاً عورتوں کی آزادی بعض لوگوں کے نزدیک انسانیت پر ایک بدنامی ہے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرمایا کہ ترقی اور عروج نتیجہ ہیں قوموں کی بعض خوبیوں کا۔ جس طرح ایک کیمیائی تحلیل سے ایک خاص نتیجہ پیدا ہونا لازمی ہے اسی طرح تاریخ کا بھی ایک مفروضہ ہے کہ جب کسی قوم میں بعض خاص خصوصیات پیدا ہو جائیں تو اس کا ترقی کرنا ایک ضروری امر ہے۔ جنگ عظیم نے جرمنی کے پرچھے اڑا دیئے تھے، معاہدہ ورسائی نے اسے اتنا بے دست و پا اور بے سروسامان کر دیا تھا کہ صدیوں جرمنی کی ترقی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن زمانہ نے دیکھ لیا اور تاریخ نے اس واقعہ کو

مخفوض کر لیا کہ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی جرمنی نے وہ قوت ہم پہنچائی کہ سار
اس کے قبضہ میں آگیا اور رصین لینڈ پر اس نے اپنا تسلط جمایا اور دنیا کی
کوئی طاقت اس کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی
حکومتیں جو رقبہ میں حیدر آباد سے بھی کم ہیں، اپنے اندر اتنا ضبط و ترتیب
رکھتی ہیں کہ بڑی سی بڑی حکومت ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔

عورت | جہان تک اخلاقی کمزوریوں کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے
کہ دنیا کے سارے ممالک کا یہی حال ہے۔ فرق اتنا ہے

کہ یورپ کی عورتیں آزاد ہونے کی وجہ سے ان کی آزادیاں نمایاں ہیں اور
ہماری عورتیں مقید ہونے کی وجہ سے ہماری برائیاں پس پردہ ہیں۔ کیا یہ
دافعہ نہیں ہے کہ کچھ دنوں قبل لکھنؤ اور دہلی کے امراء کی اولاد تہذیب اور شائستگی
سیکھنے کے لئے رنڈیوں کے پاس بھیجی جاتی تھی اور کیا اس زمانہ کا یہ فیشن نہیں
تھا کہ ہر میر کے گھر ایک طوائف ہوتی تھی اور کیا اب یہ چیزیں ہماری سوسائٹی
میں موجود نہیں ہیں۔ یورپ کی اور ہماری عورتوں میں فرق اتنا ہے کہ وہاں ہر
عورتیں آزاد رہ کر اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں اور ہماری عورتیں چار دیواری
میں مقید رہ کر عصمت تاب کھلاتی ہیں۔ اور اس کو ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ترقی کے وسائل | میرے اس سوال پر کہ ہمیں ترقی کرنے کے لئے کون سے
وسائل اختیار کرنے چاہئیں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ
اس وقت ہمارا نظام معاشری جن اصولوں پر قائم ہے وہ ہماری ترقی کے لئے
کافی ہے البتہ کچھ عقل اور بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم

نظم و ترتیب اور سائنٹفک ترقی میں یورپ کے ہم تہ نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب ہم میں یہ قوتیں پیدا ہو جائیں گی تو اس وقت عقل کا عقل سے، سیاست کا سیاست سے، علم کا علم سے، غرض تمدن کا تمدن سے مقابلہ ہوگا اور اس میں جو بہتر ہوگا وہی دنیا میں برقرار رہیگا۔ اس وقت یورپ ہر معاملہ میں ہم سے برتر و اعلیٰ ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یورپ نے ہماری ہی چیزوں کو لیکر ان میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اس کی طرف اپنا دست سوال دراز کرنے پر مجبور رہیں۔ سنسکرت کی سب سے بہترین اور مستند لغت ایک جرمن نے لکھی ہے، عربی، فارسی اور مشرقی علوم کے گہوارے یورپ کی جامعات ہیں۔ کیا ان حقائق سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

فرانسیسی قوم کی خصوصیت | فرانسیسی یورپ کا زندہ مشہور ہے اور اس میں زندگی تمام خصوصیات اچھائیاں اور برائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کم از کم اپنے زمانہ قیام میں وہ نقشہ نہیں دیکھا جو رند کے لفظ کے ساتھ ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ کے ایک فرانسیسی پروفیسر نے فرمایا تھا کہ پیرس کی سڑکوں پر جو لوگ بدھوں نظر آتے ہیں ان میں فرانسیسی بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق بلدیہ فرانس کے اعداد و شمار سے بھی کرائی گئی کہ ان لوگوں کی (۹۵) فیصد تعداد امریکن، انگریز، جرمن، اٹالوی اور دیگر لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا تجربہ ہے کہ فرانسیسی ہنایت معتدل طبیعت رکھنے والے لوگ ہیں جس طرح ان کے ملک میں ایک خاص قسم کی موزونی اور اعتدال ہے اسی طرح

ان کے مزاج کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کے ملک کے پہاڑ اور دریا نہایت مستحکم اور خوبصورت ہیں۔ فطرت نے کہیں مبالغہ نہیں کیا۔ اس طرح ان کے مزاجوں میں بھی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ لوگ شراب بھی پیتے ہیں، رقص و سرود میں بھی حصہ لیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے لطف بھی حاصل کرتے ہیں لیکن نہایت اعتدال کے ساتھ۔ ایک اوسط درجہ کے فرانسیسی کی خانگی زندگی اپنے اندر ایک نہایت موزونیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پیرس کے اوسط طبقے کی عورتیں جس قدر سلیقہ کے ساتھ لباس پہنتی ہیں وہ سلیقہ انگلستان کے طبقہ اعلیٰ کی عورتوں کو بھی نصیب نہیں ہے اور اس سلیقہ کو سیکھنے کے لئے وہ فرانس آتی ہیں۔ ان کا کھانا سستا، اچھا اور لذیذ ہوتا ہے اور اس میں ایک طرح کی ایشیائیٹ پائی جاتی ہے اور ایشیائی والوں کو اپنے اور ان کے کھانوں میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔

فرانسیسی بڑے منطقی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی بہت سی ناکامیاں ان کی اس کمزوری کے باعث ہیں۔ بقول برناڈشا جب فرانسیسی جمہوریت کا قائل ہوتا ہے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے بادشاہ کا سر کاٹ لے لیکن جب انگریز قائل ہوتا ہے تو وہ بادشاہ کو تخت پر برقرار رکھ کر جمہوریت قائم کرتا ہے۔ فرانسیسوں کے فلسفہ اور ادب میں بھی اسی منطقیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ دراصل ان کے ذہن کی ایک تجربیدی عادت ہے جس طرح ریاضی میں دو اور دو چار ہوتے ہیں اسی طرح وہ زندگی میں بھی دو اور دو کو چار دیکھنا چاہتے ہیں جو ممکن ہی نہیں۔ اور یہی انھیں ناکامی سے

سابقہ پڑتا ہے۔ انگریزوں نے بالخصوص فرانسیسیوں پر سیاست میں جو فوقیت حاصل کی ہے وہ دراصل ان کی غیر منطقییت کی وجہ سے۔

فرانسیسی طبعاً خوش مزاج واقع ہوا ہے۔ وہ کبھی یاں مشرب نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی کو ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتا ہے اور امید کی جھلک ہمیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔

فرانسیسی بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص ہے۔ آپ سے پہلی ملاقات میں وہ آپ کے خاندان بیوی بچوں اور آپ کی ساری دنیا کی چیزیں معلوم کرنے کی کوشش کریگا اور اپنی بھی چیزیں بیان کرتا جائیگا کیونکہ اسکا دل انسانی ہمدردی سے گرم ہے اور جب وہ کسی سے ملتا ہے تو کھل کر ملتا ہے کسی قسم کے تکلفات اس کے دماغ میں نہیں ہوتے وہ کم آمیزی اور دیر آشنائی کو پسند نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے انگریز سے اگر آپ کئی سال کی ملاقات رکھتے ہوں تو آپ اس سے اسی حد تک واقف ہونگے جس حد تک کے آپ کے اس کے معاملات ہیں۔ اس لئے کہ وہ غیر ضروری چیزوں کو معرض بحث میں نہیں لاتا۔ نہ وہ دوسروں کے حالات معلوم کرتا ہے اور نہ اپنے بیان کرتا ہے۔ یہ اس کے دل کی تنگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان باوجود متعدد سال انگلستان میں رہنے کے شاید ہی کسی گرم اختلاط آدمی سے ملے ہوں جو کھل کر ان سے ملتا ہو اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو اور وقت پر ان کے کام آسکے۔ بالخصوص جنوبی فرانس کے لوگ نہایت ہنس مکھ واقع ہوئے ہیں۔ آپ ان سے چاہے کتنی

غملگین باتیں کریں وہ آپ کو ہنسا دینگے اور خود بھی ایسے سوتھوں پر ہنستے نظر آئینگے
فرانیسیسی سخت معنتی اور جفاکش ہوتا ہے۔ پیرس کی گلیوں میں عیش
منانے والے باہر کے غیر ملکی ہوتے ہیں۔ اس کو اپنی ردنی مکمانے سے اتنی
کم فرصت ملتی ہے کہ بجز اس کے کہ وہ دوسروں کے لئے سامان عیش جھیا
کرے خود اس میں بہت کم منہمک ہوتا ہے۔ اس کی خوش سلیقگی کا عالم یہ ہے
کہ دوسرے خود بخود اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

فرانیسیسی عورتیں | فرانیسیسی عورتیں زیادہ تر گھریلو عورتیں ہیں جو گھر میں
رہتی بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور کھانے پکانے کا کام
کرتی ہیں۔ پیرس کی عورتوں کو دیکھ کر فرانس کی عام زندگی کے متعلق رائے
قائم نہیں کی جاسکتی۔ فرانیسیسی عورتیں عام طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتیں۔
لیکن سب تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم صرف وہی عورتیں حاصل کرتی ہیں
جو یا تو بد صورت ہوتی ہیں یا عمر میں متجاوز ہونے کی وجہ سے شادی نہ کر سکتی
ہوں۔ لڑکیوں میں شادی کی عمر اوسطاً (۲۰، ۱۹) سال کی ہے اس لئے کوئی
تعجب نہیں اگر یونیورسٹی میں بد صورت اور زائد عمر کی عورتیں نظر آتی ہوں۔

فرانیسیسی عورتوں کو اب تک سیاست میں حق رائے دہی حاصل نہیں ہے
اور نہ وہ اس کے لئے بے چین ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ جب تک ان کی حکومت
مردوں کے دلوں پر ہے ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ اس طرح بالواسطہ حکومت
ان کے اہتموں میں ہے اور ان کی رائے عامہ اپنے گھر کے مردوں کے ذریعہ
حکومت کے فیصلوں میں بڑی حد تک دخل ہوتی ہے۔ یہ دراصل فرانس کے

پیچھے ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عورتوں کو حق رائے حاصل نہیں ہے بلکہ فرانسیسی عورت سیاسی الجھنوں میں پڑ کر اپنی نسوانیت کو تباہ کرنا نہیں چاہتی۔
 بالعموم اعلیٰ تعلیم صرف ایسی عورتیں حاصل کرتی ہیں جو آئندہ زندگی میں معلمی یا اخبارات وغیرہ میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ دوسرے پیشوں میں عورتوں کو کسی قسم کے موانعات نہیں ہیں۔ اکثر عورتیں شو فر ہیں، ٹرام اور بس چلاتی ہیں اور اب پولس میں بھی بھرتی ہو رہی ہیں۔

فرانسیسی محب وطن | فرانسیسی انتہا درجہ محب وطن واقع ہوا ہے اور اس کی پگری نہایت بے جگری سے لڑنے والا ہے جس کا خود جرمن جرنیلوں کو اعتراف ہے اپنے وطن کے لئے جان دینا اس کے لئے ایک ادنیٰ بات ہے۔ سیاست میں عام طور پر اس کو تنگ نظر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ساری دنیا کی سیاست کو اپنی سیاست کے تابع دیکھنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی (کنب)
جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز پست اور میاضی میں اپنی غیر معمولی قابلیتوں کی وجہ سے
ہندوستان اور یورپ میں بے حد مشہور ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں انڈین نیشنل
اکاڈمی آف سائنس نے ہندوستان میں گزشتہ سات سال کے
دوران میں بہترین سائنٹفک کام انجام دینے کے صلہ میں آپ کو ایک
طلاتی تمغہ عطا فرمایا ہے جو ایک ایسا اعزاز ہے جس پر حیدرآباد اور
جامعہ عثمانیہ جتنا فخر کرے کم ہے۔

جرمی کے قیام کے زمانہ میں آپ نے انسٹن کے ساتھ کام
کیا ہے اور مسئلہ اضافیت پر آپ نے انگریزی میں ایک کتاب تحریر
فرمائی ہے جو زیر طبع ہے۔

آپ ہندوستان کی اکثر سائنٹفک سوسائٹیوں کے فیڈل اور
بعض معیاری سائنٹفک رسائل کے شعبہ ادارت کے رکن ہیں۔ اس سال

آپ انجمن طلیسائین عثمانیہ کے صدر بھی ہیں۔
 آپ کا قیام یورپ میں ۱۸۶۶ء تا ۱۸۷۳ء رہا۔
 ۱۸۷۶ء میں بھی آپ یورپ تشریف لے گئے ہیں۔

زندہ قوموں کی خصوصیت | باب ۲۶ میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر محمد رضی الدین
 یورپ تشریف لے گئے تو اس وقت یہ براعظم

جنگ غلیم کے اثرات سے سنبھالا رہا تھا۔ جنگ کی تباہ کاریاں جرمنی اور
 فرانس میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں اور یہی وہ دو ممالک تھے جن کا براہ راست
 جنگ سے تعلق بھی تھا اور جنگ نے بعد میں ان ہی دونوں کو سب سے زیادہ
 نقصان بھی پہنچایا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ دونوں اقوام یا کم از کم شکست
 خوردہ جرمنی مغرب ہستی سے ناپید ہو جائیگا جیسا کہ اس کے قبل یونان، روم
 اور دیگر اقوام یا تو نابود ہو گئیں یا انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں۔ اگر اس
 صورت حال سے کسی دوسری قوم کو جو طاقت و توانائی میں جرمنی سے کمتر
 ہوتی اور جو اندرونی انتشار اور بین الاقوامی نزع میں گھری رہتی، دوچار
 ہونا پڑتا تو اس کی جگہ کوئی اور طاقتور قوم لے لیتی۔

لیکن دس سال کے بعد پھر ۱۸۷۶ء میں آپ کو یورپ جانے کا اتفاق
 ہوا تو آپ نے دیکھا کہ دہاں پہلے سے بھی زیادہ زندگی کے آثار رہیں۔ اگر
 مادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ پہلے کی نسبت
 بہت آگے نکل گیا ہے اور آج بھی پہلے کی طرح سیاسی چالبازیوں اور حکمت عملیوں کا

اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ اس کی ساری قوتیں ایک دوسری جنگ کی تیاری کیلئے صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی جنگ ہوگی جو نوع انسانی کی تباہی کا باعث ہوگی اخلاقی نقطہ نظر سے جنگ کی خواہ کتنی ہی مذمت کی جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صرف وہی قوم لڑ سکتی ہے جو اپنے آپ کو زندہ محسوس کرے۔ ایک مردہ قوم ہر قسم کی ذلتوں کو برداشت کر لیتی ہے اور اس میں مقابلہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس مثال سے ایک زندہ قوم کی اُس خصوصیت کو بتلانا مقصود ہے کہ کس طرح وہ ملک کے حوصلہ شکن حالات کے باوجود طاقت بہم پہنچا کر ترقی کی راہ نکال لیتی ہے۔

اجتماعی احساس | یورپ کے مختلف ممالک میں اپنے کئی سال کے قیام کے دوران میں ڈاکٹر محمد رضی الدین کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اہل یورپ کا اجتماعی احساس ہے۔ سب کو ایک کا خیال اور ایک کو سب کا۔ انفرادیت کو بالکل قربان نہیں کر دیا جاتا اور جب تک مفاد عامہ سے انفرادیت متصادم نہیں ہوتی اس کو ترقی دی جاتی ہے۔ انانیت کو سوسائٹی برداشت نہیں کرتی اور ہر قسم کی حکومتیں شہنشاہیت سے لیکر جمہوریت تک اس کو کچلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر کسی شخص نے ایک معینہ مقدار سے زیادہ دولت جمع کر لی ہو اور وہ بخوشی خیراتی کاموں میں اپنی کچھ رقم نہیں لگاتا ہے تو حاصل کی صورتوں میں اس سے یہ رقم وصول کر لی جاتی ہے۔ راک فیلر، کایرینج اور فیلڈ جیسے لوگوں نے اتنی خیرات کی کہ ان کا شمار قومی خیر خواہوں میں ہو گیا۔ تقریباً تمام سائنٹفک ترقی

جامعات، تجربہ خانوں اور تحقیقاتی اداروں میں ہوتی ہے جو خانگی اشخاص کے قائم کردہ اور ان کے سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔ بعض وقت حکومت بھی ان چندوں میں شریک ہو جاتی ہے لیکن یہ بھی محض اس لئے ہوتا ہے کہ خانگی اشخاص کو ترغیب دی جائے۔ مثال کے طور پر جب جامعہ کیمبرج کے کتب خانہ کی از سر نو تعمیر کی شدید ضرورت محسوس کی گئی تو حکومت نے اس شرط پر نصف اخراجات کی پابجائی کا وعدہ کیا کہ آدھی رقم خانگی طور پر جمع کی جائے ایک اور مثال ہے وہ یہ کہ تمام ہسپتال بالکل خانگی چندوں سے چلائے جاتے ہیں۔ اور ایک غریب مزدور بھی جب وہاں علاج کے لئے جاتا ہے تو وہ خیراتی صندوقچہ میں ایک آدھ پیسہ ڈالنا کبھی نہیں بھڑکتا۔ اگر اس کا یہ فعل کسی کا رخیر میں حصہ لینے کی نیت سے نہ بھی ہو تو کم از کم اس کو یہ خیال مزدور ہے کہ ممکن ہے اس کا یہی پیسہ کل اسی کے کام آئے۔ اور ان دونوں صورتوں میں ہسپتال کا فائدہ ہے۔ اس طرح ہسپتال کے اخراجات کے لئے چندے جمع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح سائنٹفک ایجادات و اختراعات کے لئے انعامات مقرر ہیں تاکہ کام کرنے والے ہیٹھ نہوں اور انہیں کام کرنے کی ترغیب ملتی رہے۔ فنون کی تائید میں کتنا ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس پیسوں صدی کی دنیا میں کسی قوم کی حقیقی ترقی کا انحصار سائنٹفک ایجادات پر ہے ورنہ اس کے بغیر جاپان کے مقابلہ میں ہندوستان کی سیاسی و معاشی پستی کی کیسے توجید ہو سکتی ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ادب، موسیقی، اور فلسفہ میں

ہندوستان جاپان سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہے لیکن ہم مشنری کا تخیل سے مقابلہ کرنے سے رہے۔

رائے عامہ | لیکن محض سائنٹفک معلومات ہی کافی نہیں ہیں۔ نہ صرف ہماری جامعات اور تجربہ خانوں میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں سائنٹفک راویہ نظر کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں افراد اور جماعتوں کے اعمال پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ملک میں تعلیم یافتہ رائے عامہ کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ مغربی ممالک میں اکثر چیزیں محض اس وجہ سے کامیاب یا ناکام ہوتی ہیں کہ رائے عامہ ان کی تائید یا مخالفت میں ہوتی ہے۔ لیکن رائے عامہ کے لئے عام تعلیم کی ترویج ضروری ہے اور اس کے بعد ہی لوگ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یورپ کے کسی قبضہ کے کوچوں اور ہوٹلوں میں مزدور پر مشیمہ مرد اور عورتوں کو اہم مسائل حاضرہ پر بحث و تمحیص کرتے دیکھنا ایک معمولی سی بات ہے۔ براعظم میں ڈاکٹر محمد رضی الدین کو بارہا اتفاق ہوا کہ معمولی لوگوں نے آپ سے شیگور اور ان کی گیتان جلی، جہاتاگانا ندھی اور ان کی قومی تحریک اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے متعلق استفسار کیا۔ ہر یورپ جانے والے کو اس قسم کے تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔

یورپ کی ترقی کا راز | ترقی کوئی جامد و ساکن شے نہیں ہے اور نہ ترقی کرنے کے کوئی معین اصول ہیں۔ ہر قوم کو اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لیکر آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل

مرتب کرنا چاہیئے۔ یورپ کی ترقی کے راز کو کسی ایک ضابطہ کے ذریعہ نہیں بتلایا جاسکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص یورپین ممالک کی ترقی کے متعلق اپنے مشاہدات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنا چاہیئے تو وہ یہ کہیگا کہ وہ لوگ علم حاصل کر کے اس کی اشاعت کرتے ہیں، اس علم سے قوت حاصل کی جاتی ہے اور اس قوت کو چند افراد کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔



ڈاکٹر سید محی الدین قادری نور

ڈاکٹر سید محی الدین قادری نور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن)
ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے
پروفیسر ہیں۔ ایک بلند پایہ مصنف ادیب و نقاد کی حیثیت سے آپ سارے
ہندوستان میں مشہور ہیں۔ آپ کی بعض تصانیف اکثر ہندوستانی
جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ آپ حیدرآباد کے مشہور ادارہ ادبیات
اردو کے معتمد عمومی ہیں اور آپ کی سرکردگی میں زبان و ادب کے مختلف
اصناف پر نوجوان مصنفین کی ایک جامع کام کر رہی ہے۔
آپ کا قیام انگلستان و فرانس میں ۲۷ سالہ سلسلہ رہا۔

خصوصیات | ہندوستانی طالب علم کا مطلع نظر عام طور پر مغرب انگلستان ہے
جو زیادہ مفید نہیں۔ انگلستان کی تعلیم اس حد تک مفید ہے
کہ وہاں کی ڈگریاں ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہیں اور دوسرے ممالک کی ڈگریاں

کے مقابلہ میں ان ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے نوجوان بھی برطانوی ہند کے طلباء کی طرح زیادہ تر انگلستان جاتے ہیں۔ جس شخص کو انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، سوئیڈن، لینڈ اور اٹلی میں کافی عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہی اس امر کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان ممالک کی زندگی میں کیا فرق ہے اور طالب علم کی ہنسی نشوونما وہاں کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے۔ متذکرہ ممالک کے منجملہ فرانس کی زندگی ہندستان کے طالب علموں کے لئے انگلستان کے قیام سے زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔ انگلستان میں ہندستانی طالب علم اپنے سرے اس خیال کو کسی وقت جدا نہیں کر سکتا کہ وہ ایک محکوم قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے آقاؤں کے ملک میں شاید غلامی کے طریقے سیکھنے آیا ہے۔ کوئی انگریز خواہ وہ قدامت پرست ہو یا لبرل کسی کالے آدمی کو برابر کی نظر سے دیکھنا گوارا نہیں کریگا۔ اور شاید یہی وہ راز ہے جس نے انگریزوں کی شہنشاہت کے بھرم کو اب تک باقی رکھا اور آئندہ کیا تعجب ہے کہ یہی اس کے نقصان کا باعث ثابت ہو۔ لیکن جو طالب علم محض انگلستان میں رہ کر ہندستان واپس آجاتا ہے وہ کبھی محسوس نہیں کر سکتا کہ اہل انگلستان کا تعلق اس کے ساتھ کس قدر حوصلہ شکن ہے۔ بہت سے اصحاب انگلستان کو جاتے یا آتے ہوئے براعظم کے بھی بعض شہروں کا چند دنوں اور بعض وقت تو چند گھنٹوں کے لئے معائنہ کر لیتے ہیں اور وہاں کی بعض ایسی چیزیں دیکھ لیتے ہیں جنہیں ان بڑے بڑے شہروں کے لالچی رہنما ان سے پیسہ

وصول کرنے کے لئے دکھانے لے جاتے ہیں۔ اور یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ یہی ان شہروں کی زندگی ہے اور اسی کو دیکھ کر وہ سارے ملک کی زندگی اور معاشرت کے متعلق اندازہ قائم کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی مقامات اور اسی قسم کی دلچسپیاں خاص شہر لندن میں بھی موجود ہیں لیکن یہاں یہ باتیں قانوناً جرم ہیں اور خفیہ طور پر جاری ہیں۔ براعظم کے شہروں میں ان پر زیادہ قیود عائد نہیں ہیں۔ لندن کی ان دلچسپیوں سے ہندستانی طالب علم شاید بہت کم مستفید ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے آقاؤں کے رعب اور قانونی شکنجے کے خوف سے ان باتوں کی طرف کھلم کھلا رخ نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ لندن میں ایسی چیزیں موجود ہی نہیں ہیں۔

فرانس کے تعلیمی ادارے | جہان تک تعلیمی اداروں کا تعلق ہے پیرس ایک بین الاقوامی مرکز ہے۔ یہاں سفر

شام، ایران، افغانستان، ترکی، سیام، چین، الجزائر اور مراکش وغیرہ کے ہزار طلباء سے میل جول اور تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ لندن یونیورسٹی میں سینکڑوں ہندستانی طلباء ہر سال شریک ہوتے ہیں لیکن وہاں پیرس یونیورسٹی کی طرح کوئی ادارہ تمدن ہند موجود نہیں ہے۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی کے اس ادارے کا ہر ماہ ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں وہ تمام فرانسیسی، انگریز اور ہندستانی اصحاب جمع ہوتے ہیں جنہیں ہندستانی تہذیب و تمدن سے دلچسپی ہے۔ اس مجمع کو صرف طالب علموں ہی سے تعلق نہیں رہتا بلکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کا (جن میں پروفیسروں، عہدہ داروں، وکلاء،

اور تاجروں کے بھی کافی افراد شریک ہوتے ہیں) دخل ہوتا ہے۔ اس طرح سے ہندوستانی طالب علم نہایت آزادی اور خوبی کے ساتھ اپنے مسائل، ضروریات اور رجحانات کے متعلق ان ہمدردوں سے تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں۔

یہی حال ادارہ تہذیب و تمدن اسلامیہ کا بھی ہے۔ یہ ادارہ متذکرہ ادارہ سے زیادہ شاندار، کامیاب اور مفید ہے۔ اس لئے کہ اس میں ہندوستان کے طالب علم کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو شاید ہی دنیا کی کسی اور یونیورسٹی میں حاصل ہو سکے۔ اس ادارہ میں شرکت کے بعد ایک مسلمان طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حج کے لئے مکہ معظمہ میں دنیا کے ہر خطے سے مسلمانوں کو جمع کرنے کا جو انتظام کیا تھا وہ کن فوائد کی بنا پر تھا۔ اس ادارے کے اجلاس میں ہر اسلامی ملک کے باشندے جمع ہوتے ہیں اور یہیں ایک مسلمان طالب علم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہم مذہب دنیا کے دوسرے خطوں میں سرسبز و شاداب ہیں یا مصائب سے گزر رہے ہیں ان ہی جلسوں میں وہ تمام اصحاب اور ان کے متعلقین شریک ہوتے ہیں جو کسی زمانہ میں کسی نہ کسی اسلامی ملک کے حکمران رہ چکے تھے۔ ترکی خاندان شاہی کے افراد، امان اللہ خاں کے بھتیجے، سلطان احمد شاہ سابق شہنشاہ ایران کے متعلقین، مصر و الجزائر وغیرہ کے حاکم امر اور ان کی پودسب یہاں ایک دوسرے سے ملتی ہے اور اس طرح سے یہ بکھرے ہوئے موتی ایک دوسرے کو اپنی آب و تاب دکھا سکتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جو لندن میں رہنے والا مسلمان طالب علم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس ادارے کے جلسوں کا پہلے ہی سے

نظام الاوقات مقرر ہو جاتا ہے اور کبھی ایرانی طلباء اور طالبات اپنے مشاہیر شعرا کے کلام سے اہل جلسہ کو لطف اندوز کرتے ہیں اور کبھی مصر و شام یا ترکی و مراکش کے طلباء اپنی ادبیات اور معاشرت کے متعلق دلچسپ باتوں سے مستفید کرتے ہیں۔ ان اداروں میں جو پروفیسر یا حکومت کے عہدہ دار شریک ہوتے ہیں وہ اپنے موضوع کے اس قدر گرویدہ ہوتے ہیں کہ ان نوجوانوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہ صرف مساویانہ بلکہ بعض دفعہ ایسے خاکسارانہ ہوتے ہیں کہ یہ طلباء اپنے آپ کو ان سے بلند و برتر سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ پروفیسر اور دیگر حضرات استفادے کی خاطر آتے ہیں نہ کہ حکومت اور نوبت جتانے کے لئے۔ اسی طرح ایک انگریز پروفیسر اور ایک فرانسیسی پروفیسر کے برتاؤ میں ہندوستانی طالب علم کو بین فرق محسوس ہوگا۔

جاپان اور حیدرآباد کا مقابلہ | میرے اس سوال پر کہ جاپان اور حیدرآباد نے ایک ساتھ مغربی تعلیم شریوع کی اور مغربی تمدنی اثرات قبول کئے لیکن ترقی کی دوڑ میں جاپان بہت آگے نکل گیا اور ہم جہاں کے وہیں رہے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے سب سے پہلے یہ بات معلوم کرنی ضروری ہے کہ جاپان سے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جو طلباء نکلے وہ کن ممالک میں گئے اور واپس آنے کے بعد کس ماحول میں انھیں کام کرنا پڑا۔ یوں تو دونوں جگہ سے طالب علم نکلے لیکن ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کے طالب علم کا سطح نظر آخر تک صرف انگلستان رہا۔ اس کے برخلاف جاپانی طلباء امریکہ،

فرائض اور جرمنی بھی جاتے رہے۔ انگلستان سے حیدرآباد کے طلباء نے انگریزوں کی تنظیمی قابلیت کو سیکھنے کے مقابلہ میں ان کی اس خصوصیت کو حاصل کیا جو حکومت اور شہنشاہیت سے متعلق ہے۔ حیدرآبادی طلباء علم حیدرآباد کو واپس ہونے کے قبل اس حاکمانہ رعونت اور خود پسندی میں بیک آتا ہے جو وہ انگلستان میں اپنے آقاؤں سے سیکھتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ایک انگریز اس کو اپنی ماتحت قوم کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے کم درجہ سمجھے تو شاید حتیٰ بجانب ہے لیکن وہ اپنے وطن میں آنے کے بعد اس کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اپنے غریب ہموطنوں اور اپنے قدیم ساتھیوں کے ساتھ غرور سے ملنا اور حماقت کے آثار نظر کرنا اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ، خود دار اور مدبّر ہونے کی دلیل ہے۔ وہ انگلستان یہ سمجھ کر جاتا ہے کہ میں وہاں سے حکومت کے طریقے سیکھ کر آؤں گا اور اس خیال سے نہیں جاتا کہ میں ملک کی خدمت کے طریقے سیکھ کر آؤں۔ جا پانی طلباء پہلے تو انگلستان کو کم جاتے ہیں اور جو جاتے بھی ہیں تو وہ اپنے کو انگریزوں کے ماتحت نہیں سمجھتے اور نہ انگریز ان کے ساتھ آقاؤں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بجائے خواجگی اور بندگی کے شیوں کو حاصل کرنے کے انگریزوں کی وہ خصوصیتیں حاصل کرتے ہیں جو ملک دمالک کی خدمت سے متعلق ہوں۔ انگلستان کے علاوہ جو جا پانی طلبہ دوسرے ممالک میں جاتے ہیں انہیں تو ان خصوصیات سے ساتھ ہی نہیں پڑتا۔

جا پانیوں اور حیدرآبادیوں میں بہت بڑا فرق ملکی ماحول کا بھی ہے۔

جاپان اتفاق سے بیرونی اثر و اقتدار سے محفوظ رہا اور حیدر آباد اتنا ہی ان اثرات کا شکار۔ حیدر آبادی علم انگلستان یا یورپ کے کسی اور ملک سے خواہ کیسے ہی اعلیٰ اوصاف سے متصف ہو کر آئے یہاں اگر اس کو ایک ایسے ماحول سے سابقہ پڑتا ہے جس میں اسے اپنے ان تمام اوصاف سے ہاتھ دھو دینا ضروری ہے۔ یہاں کے حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ انسان اپنے اصلی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

قومی نصب العین کا تعین | کام کا سب سے بڑا محرک کسی مقصد کا تعین ہے۔ جب تک

ملک و قوم کے آگے کوئی خاص نصب العین معین نہ ہو جائے گا اس وقت تک اس کی تمام قوتیں معطل رہیں گی۔ اگر ہمارے یورپ جانے والے نوجوانوں کا کوئی نصب العین ہے تو وہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ملک کو واپس ہونے کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائیں۔ ذاتی اغراض اور موقعی مناد کسی قوم کو شاہ راہ ترقی پر نہیں آنے دیتے۔ اور ایسا معاوم ہوتا ہے کہ ان ہی دو امور کے سوا نوجوان حیدر آبادیوں کے پیش نظر کوئی اور امر نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک حیدر آباد کے جملہ ارباب اقتدار ایک نصب العین کی طرف نہ بڑھیں گے اور ہر ایک کے پیش نظر سوائے اس خاص سر زمین کی بہبودی اور فلاح کے کوئی اور خیال نہ ہوگا اس وقت تک یورپ سے

تعلیم پا کر واپس شدہ حضرات کی کوششیں تو کیا اگر کوئی شخص آسمان سے
بھی کام کرنے کے دلوے اور اہلیت کی صلاحیتیں لیکر آئے تو کوئی فائدہ
نہیں ہو سکتا۔ بحالات موجودہ سرزمینِ دکن کی مثال کان نمک کی
سی ہے۔ ہر صلاحیت اور ہر خصوصیت اس میں آکر نمک بن
جاتی ہے۔

————— (❖) —————

مولوی حبیب الرحمن صاحب

مولوی حبیب الرحمن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ یس۔ سی (الذین)
سرداشتہ معلومات عامہ سرکار عالی کے ناظم ہیں۔ اس سے قبل آپ
جامعہ عثمانیہ کے شعبہ معاشیات کے صدر اور حیدرآباد اکنامک سوسائٹی
کے سرگرم معتد تھے۔ ہندوستانی اور حیدرآبادی معاشی و اقتصادی
مسائل پر آپ کو بڑی دستگاہ حاصل ہے۔ آپ نے اصول معاشیات
پر اردو میں ایک کتاب معاشیات بھی تحریر فرمائی ہے جو اس موضوع
پر ایک بہترین معیاری کتاب ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

خانگی ادارے | انگریزوں کی زندگی میں پروفیسر حبیب الرحمن کو جس چیز
نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کے خانگی اداروں
(Voluntary Organisations) کی جدوجہد ہے۔ جب کسی شخص کے ذہن میں

کوئی بات آتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ملک و قوم کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو انگلستان کی فضا میں اس کا امکان ہے کہ ایسا شخص کچھ اپنے ہم خیال پیدا کر کے ان کے اتحاد سے ایک خاص جماعت تشکیل دے اور اپنے خیالات کی توسیع و اشاعت کے لئے خانگی کوششوں سے عملی تدابیر اختیار کرے۔ بہر کیف وہاں کسی اصلاح یا تحریک کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ سرکاری عہدہ داروں ہی کو سمجھائی دے اور حکومت ہی کی جانب سے اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ملک میں بیسیوں ایسے ادارے اور خانگی انجمنیں قائم ہیں جو مختلف طریقوں سے ملک کی معاشرتی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ ان انجمنوں کے کام کی نوعیت اور مقاصد پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جس میں مشترک مفاد اور اجتماعی کام کرنے کا امکان ہو ایسی نہیں جس کے لئے ایک آدھ انجمن قائم نہ ہو۔ پھر خوبی یہ ہے کہ ملک کی یہ تمام انجمنیں ایک مرکزی قومی انجمن کے تحت ہیں جس کو حکومت و قعت کی نظروں سے دیکھتی ہے اور اس کی کارروائیوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس انجمن سازی سے نام و نمود حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ اس کا اولین مقصد ملک کی خدمت اور اراکین میں اتحاد پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ان انجمنوں کو سربراہ اور کام کرتا دیکھا کہہنا پڑتا ہے کہ انگریزوں میں اجتماعی طور پر کام کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ بلکہ ہم میں سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ہمارے افلاس کی وجہ سے ہم اس قسم کے رفاہی کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ ان کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے

یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جب ایک بار کوئی کام شروع ہو جائے تو اس کے چل پڑنے کی خود بخود دسیل نکل آتی ہے کیونکہ بے لوث اور بے غرض محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں ان معاملات میں دلچسپی لینے کے لئے تنہا حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ مثل مشہور ہے جیسی روح ویسے فرشتے جیسے افراد ہونگے ویسی ہی حکومت ہوگی۔ اگر افراد کو ان چیزوں کا خیال ہے تو حکومت کو بھی ان کا خیال کرنا ضروری ہے۔

انگلستان میں ابتدائی تعلیم بالکل فنانگی اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس ایک طرف حکومت اخراجات سے بچ جاتی ہے تو دوسری طرف اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے معاش کا ذریعہ نکل آتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے پاس کے اکثر عہدہ دار اپنی ملازمت کی وجہ سے اضلاع پر رہنے مجبور ہیں لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے بلکہ یہیں دو ایک اقامت قائم ہو جائیں تو کیا یہ مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔

انگریزوں کی خصوصیات | انگریزوں کی ایک اور قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کے دولت مند اور ذی ثروت لوگوں میں اپنے ملک و قوم کو فائدہ پہنچانے کا بڑا خیال ہے۔ چنانچہ اخبارات میں روزانہ وصیتوں کی متعدد اطلاعی شایع ہوتی رہتی ہیں جن میں خصوصیت سے خیراتی کاموں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ لیکن انگلستان اور ہمارے ملک کی خیرات کے طریقوں میں بڑا فرق ہے۔ وہاں اجتماعی خیرات پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں انفرادی طریقوں پر۔ خیرات کا مفہوم

سمجھنے میں بھی انگریزوں کے اور ہمارے نقطہ نظر میں فرق ہے وہ لوگ خیرات خیرات کی خاطر کرتے ہیں اور ہم حصول ثواب اور عاقبت کے خیال سے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری خیرات میں غیر مستحقین زیادہ حقدار ہیں اور ان کی خیرات میں مستحقین۔ مثال کے طور پر کسی درگاہ یا مندر کے لئے کسی جائیداد کا وقف کرنا قومی نقطہ نظر سے کوئی اعلیٰ درجہ کی خیرات نہیں ہے کیونکہ اس میں بجز سجادہ نشین یا پجاری کے بحیثیت مجموعی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اسی طرح ہماری اور انگریزوں کی ذہنی کیفیتوں میں بھی بڑا فرق ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کسی طرح گزر جاتی ہے لیکن وہاں کوشش کی جاتی ہے کہ اچھی طرح گزرے۔ اس کی ادنیٰ مثال یہ ہو سکتی ہے کہ چٹھیاں یہاں بھی ہوتی ہیں اور وہاں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ ہماری چٹھیاں ہمارے آرام کے گھنٹوں میں گپ بازی میں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں میں اضافہ کر دیتی ہیں تو وہاں ان کا لہجہ بہترین طور پر صرف کیا جاتا ہے۔ اگر عثمان ساگر یا حایت ساگر جیسے خوبصورت تالاب انگلستان میں ہوتے تو دیکھتے ان کی کیسی قدر ہوتی۔ ان کے اطراف آبادیاں بس جاتیں، آمد و رفت کے لئے موٹروں اور ٹرام کا انتظام ہو جاتا، دکانیں کھل جاتیں، ہوٹل اور رسٹوران لگ جاتے لیکن یہاں بجز خوش حال لوگوں کے ان تالابوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

یورپ اور انگلستان کی زندگی میں خرابیاں بھی ضرور عورت پائی جاتی ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے جو معنی وہاں لئے جاتے ہیں وہ ایک صحت مند معاشرہ کے لئے زیب نہیں دیتے۔ مرد اور عورت

کی معاشی یکسانیت نے اخلاقی نصب العینوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ یورپ کے جس ملک میں بھی آمریت قائم ہو رہی ہے وہاں عورتوں کے خلاف سخت طرز عمل اختیار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہٹلر نے عورتوں کو ملازمتوں سے علیحدہ کر کے گھر بٹھا دیا ہے اور دلن پر سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں یورپ کی عورتوں کی آزادی کے جتنے قصے سنے جاتے ہیں وہ جنگ کے بعد کے ہیں اور نتیجہ میں جنگ کے معاشی و اقتصادی اثرات کا۔ ورنہ جنگ سے پہلے یورپ کی عورتیں دائرہ اعتدال میں تھیں۔ ہمارے ملک کے بھی بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ہماری عورتوں کا پردہ ہماری ترقی میں بڑا سد راہ ہے۔ اس کے اٹھتے ہی ساری بندشیں ٹوٹ جائیں گی اور ہم بڑی سرعت سے ترقی کے منازل طے کر لینگے۔ یہ محض سراب ہے۔ اس کے لئے خاص ماحول اور خاص حالات کا پیدا ہونا ضروری ہے اور سب سے پہلے تعلیم کی ترویج کی سخت ضرورت ہے۔ بحالت موجودہ ہمارا پردہ ہماری ترقی میں کمی سطح مزاحم نہیں ہے۔



مسز جمال الدین

مسز جمال الدین بی۔ اے ملک کی ایک روشن خیال خاتون ہیں آپ نے ۱۹۱۱ء میں میٹرک کامیاب کیا لیکن بلکہ میں کوئی زمانہ کالج ہونے کی وجہ سے آپ سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ تیرہ سال بعد جب کالج اناٹا جامعہ عثمانیہ کا افتتاح ہوا تو باوجود اس کے کہ بیوی اور ماں کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا آپ نے تعلیم کی طرف توجہ کی اور ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے کامیاب کیا۔ ۱۹۲۹ء میں سرکاری وظیفہ پر یورپ گئیں۔ لندن میں فرہیل اور آملی میں دانشوری طریقہ تعلیم کی ٹریننگ حاصل کی۔ آپ ماڈل پرائمری اسکول کی صدر معلمہ ہیں۔

آپ کا تھام یورپ میں ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

تعلیم | مسز جمال الدین کے خیال میں یورپ کے اکثر ممالک سے بدرجہا بہتر ماہان ہے جہاں آپ حال ہی میں عالمی تعلیمی کانفرنس ۱۹۳۶ء کے

سلسلہ میں حکومت سرکار عالی کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئی تھیں۔ آپ جاپان اور اس کے تعلیمی، معاشی و اقتصادی حالات سے اتنی متاثر ہیں کہ آپ مشرق کے اس نوخیز ملک کو یورپ پر ترجیح دیتی ہیں۔

جاپان کے ہر مدرسہ میں ایک شعبہ صنعت ضرور رہتا ہے۔ بچپن ہی سے بچوں کو مختلف پیشوں اور مشنریوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ کنڈرگارٹن میں مشین و آلات سب بچکانی ہوتے ہیں اور بچے بڑے شوق سے ان اشیاء کو استعمال کرتے ہیں۔ ہر مدرسہ میں نہانے کے حوض ہوتے ہیں۔ اور تین تین چار چار سال کے بچوں کو تیرنا سکھایا جاتا ہے۔ بچوں کی پڑھائی میں کسی وقت نامے کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بچوں کو اپنے فطری میلانات کو فروغ دینے کا کافی موقع دیا جاتا ہے۔

جاپان میں لڑکیوں کے لئے ایک فن کاری کا مدرسہ ہے عموماً میٹرک کے بعد لڑکیاں اس میں شریک ہوتی ہیں۔ جو لڑکیاں کلچر کا کورس ختم کرنے کے بعد آتی ہیں ان کا انصاب مختصر ہوتا ہے۔ اس مدرسہ میں لڑکیوں کو مختلف کام کاج سکھائے جاتے ہیں۔

جاپان میں ایک اور تعلیم گاہ ہے جس کو مدرسہ عروسی مدرسہ عروسی کہتے ہیں۔ شادی سے قبل ہر لڑکی کو ایک سال یہاں تعلیم حاصل کرنی لازمی ہے۔ اور انھیں ادب و واجبی زندگی، صنعتی معاملات، بچوں کی نگہداشت، بچوں کی بیماریاں، گھر کی صفائی اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ جاپان میں اس مدرسہ کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ

جب تک لڑکی کے پاس یہاں کا صداقت نامہ نہ ہو اس سے کوئی شادی نہیں کرتا۔
وطن پرستی | تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکوں کے لئے دو سال فوجی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ جاپان کا ہر مرد سپاہی ہے خواہ وہ کاروبار کرے، فیکٹری میں ملازم رہے یا کوئی اور کام کرے۔ حالیہ جنگ چین و جاپان کے شروع ہونے کے وقت مسز جمال الدین جاپان میں تھیں اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح لوگ بغیر کسی ہوسے کے جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جاپانی اپنے بادشاہ کو خدا کے برابر سمجھتے تھے۔ تعلیم اور ترقی کے ساتھ گو آج کل ان خیالات میں اتنی شدت باقی نہیں رہی تاہم وطن پرستی میں جاپانی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بچے | جاپان میں بچوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بچوں کو ہمیشہ ساتھ رکھا جاتا ہے۔ آپ نے یورپ کے اس طریقہ کی مذمت کی کہ ماں باپ اپنی سیر و تفریح کی خاطر بچوں کو یا تو اکیلے گھر میں چھوڑ جاتے ہیں یا ملازمین کے حوالے کر دیتے ہیں جاپان میں بڑے بڑے سینما اور دکانوں میں بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ہال رہتا ہے۔ یہاں بچوں کو چھوڑ کر ایک نمبر چال کر لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ روئے یا بھوکا ہو جائے یا غلاطت کر دے تو نمبر کے حوالہ سے آلہ مکبر صوت پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ نمبر کا قاعدہ مدرسوں میں بھی ہے۔ جو بچے ملازمین کے ساتھ مدرسہ آتے ہیں انھیں مدرسہ کی جانب سے ایک نمبر دیدیا جاتا ہے۔ اگر والدین چاہیں بھی تو بچوں کو اس نمبر کے بتلائے بغیر نہیں لیجا سکتے۔

یورپ کی تقلید | مسز جمال الدین کا خیال ہے کہ یورپ کی عورتوں کی تعلیم کی ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن پبلک اسور میں دلچسپی لینے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ گھر کے انتظام میں امتیاز پیدا ہو۔ ان دونوں میں توازن کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ جن مخصوص پیشوں یا ملازمتوں میں عورتیں داخل ہو سکتی ہیں وہ تعلیم و تدریس، طبابت اور ننگ ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ملازمتیں ہماری عورتوں کے لئے بیکار ہیں۔

پرودہ | جب تک تعلیم عام نہ ہو اور ملک کے حالات اجازت نہ دیں پرودہ کا اٹھ جانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن موجودہ پردے میں کچھ ترمیم ہونی ضروری ہے۔ عورتیں نہ بالکل پردے میں رہیں اور نہ علانیہ باہر بھریں۔ ان دونوں کے بین میں رہنا اچھا ہے۔ عورتوں کی صحت و تندرستی کے مد نظر ان کے لئے سیر و تفریح کا انتظام ہونا چاہیئے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں جو یک نصابی پائی جاتی ہے اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ علاوہ مذہبی تعلیم کے لڑکیوں کی تعلیم میں امور خانہ داری کو زیادہ دخل ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی ہمارے پاس اگر عودسی مدارس بھی قائم ہوں تو اس سے بہت مفید نتائج برآمد ہونگے۔ تعلیم ادھوری ہونے کی وجہ سے لڑکیاں ہر کام میں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

ہم تعلیمی | اہم تعلیمی کے متعلق مسز جمال الدین فرماتی ہیں کہ

تختانیہ کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں۔
 البتہ تختانیہ تک جن لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ رہی ہے اگر یہی بچے
 ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کریں تو ان کی تعلیمی جاری رکھی جاسکتی ہے۔
 سفر | عورتوں کو اگر سفر کے موقعے بہم پہنچائے جائیں تو اس سے ان کو بہت
 فائدہ حاصل ہوگا۔ سفر سے وسیع النظری اور خیالات میں نئی پیدا
 ہوتی ہے اور نکالیف برداشت کرنے سے تجربہ حاصل ہوتا ہے اور دوسرے
 لوگوں کو دیکھ کر اپنی برائیوں اور اچھائیوں پر نظر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

۱۲۷۶ھ

(ہان)

الحاج ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ پی۔ بیچ۔ ڈی
ڈی۔ لٹ (پیرس) جامعہ عثمانیہ کے ایک مایہ ناز فرزند اور اس کے شعبہ
قانون کے لکچرار ہیں۔ جامعہ سو برون (پیرس) نے جس کے آپ ہندوستان
میں سرکاری نمائندہ بھی ہیں حال ہی میں اپنے پاس توسیعی تقاریر کے لئے
آپ کو مدعو کیا ہے چنانچہ گذشتہ دسمبر آپ فرائض تشریف لے گئے ہیں
آپ نے ”اسلامی قانون میں الممالک“ کے نام سے اردو میں
ایک کتاب شائع کی ہے جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔
آپ کا قیام یورپ میں ۱۳۲۷ء تا ۱۳۳۵ء رہا۔

تربیت اطفال | جرمنی میں والدین بچوں کو چھ سال کی عمر کے بعد مدرسہ
سیچنے پر مجبور ہیں۔ جہاں ابتداء ہی سے انھیں فوجی زندگی
کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ ہوائی بندوق ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور ان کیلئے

ایسے کہیل منتخب کئے جاتے ہیں کہ آئندہ چل کر وہ سپاہیانہ زندگی کے لئے تیار رہیں۔

جرمنی میں بچوں کی تربیت کے لئے Wander Vogel کا طریقہ جس کے لفظی معنی ”بھٹکنے والا پرندہ“ ہیں، بہت مقبول ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جتنا ممکن ہو کھلی ہوا میں زندگی بسر کی جائے۔ یہ تحریک زیادہ تر نو عمر بچوں اور لڑکیوں میں عام ہے۔ حکومت بھی امداد کرتی ہے۔ راتوں میں قیام کے لئے حکومت کی جانب سے ہر آٹھ دس میل پر مکانات تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔

کتبخانے افزائش کے سرکاری کتب خانہ کا شمار دنیا کے مشہور کتب خانوں میں ہے عربیات پر اس کتب خانہ میں بہت کم مطبوعہ کتب ہیں۔ یہاں پڑناظرین کو کسی دن تین سے زائد کتابیں نہیں دی جاتیں اور گرمیوں کے زمانہ میں تو (۷۷) فیصد کتب فرائش کے خلاف لائی جاتی ہیں اور اس غلطی کا خمیازہ ناظر ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پیرس میں مشرقی زندہ زبانوں کا ایک قومی کتب خانہ ہے جہاں عربی کے تحقیقاتی کام میں کافی مدد ملتی ہے مگر اس کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لئے خصوصی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کا کتب خانہ ابتر حالت میں ہے پروفیسر مانی کتابیں لے لیتے ہیں جس کی وجہ سے طلباء کو وقت پر کتابیں نہیں ملتیں۔

جرمنی کے کتب خانے دنیا کے دوسرے ممالک کے کتب خانوں سے بہتر حالت میں ہیں۔ پبلک کتب خانوں میں ایک قسم کا وفاق پایا جاتا ہے اور تمام کتب خانے آپس میں ایک دوسرے کو کتابیں مستعار دیتے ہیں۔ اس کی

فیس بھی برائے نام ہوتی ہے۔ اس طریقہ کو Leih system کہتے ہیں اس وفاق میں بعض غیر ممالک کے کتب خانے بھی شریک ہیں جیسے روس، آسٹریا کے کتب خانے، یکمہرج اور انڈیا آفس کے کتب خانے وغیرہ۔

جامعات میں شعبہ داری کتب خانے ہوتے ہیں۔ ریسرچ کے طلباء کو کتب خانوں کی کنجیاں دیدی جاتی ہیں۔ توٹن یونیورسٹی کے کلیہ شریقات کا کتب خانہ صبح کے سات سے رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے اور طلباء جتنی چاہتے کتابیں لے سکتے ہیں اور گھر بھی لے جاسکتے ہیں۔

لیپزنگ کے ایک کتب خانہ میں جرمن زبان کی جملہ مطبوعہ کتب موجود ہیں اور یہ اس سرعت سے ترقی کر رہا ہے کہ دس سال کے اندر بلحاظ تعداد کتب یہ یورپ کا سب سے بڑا کتب خانہ ہو جائیگا۔ اس کتب خانے کے دو حصے ہیں: (۱) حصہ کتب (۲) عجائب خانہ جہاں زمانہ قدیم سے اب تک دنیا کی ہر زبان کی تحریر کے نمونے اور لکھائی سے متعلق جملہ چیزیں ہیا کی گئی ہیں۔

جرمنی میں جامعات اور کتب خانوں کا جو حال پھیلا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سترہئہ تک جرمنی میں متعدد خود مختار ریاستیں تھیں جو ہمارک کے زمانہ میں ایک وفاق میں منسلک ہوئیں۔ خود مختار ہونے کی وجہ سے ہر ریاست میں ایک جامعہ اور کتب خانہ کا ہونا ضروری تھا۔ جرمنی میں مشرقی علوم و فنون سے غیر معمولی دلچسپی کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ جب جرمنی کے مشہور مستشرق اور جامعہ یون کے عربی کے پروفیسر مسٹر سی-یچ-بکروزیہ تعلیمات مقرر ہوئے تو انہوں نے مشرقی علوم کی طرف زیادہ توجہ صرف کی۔

اس خدمت جلیلہ سے بسکدوش ہونے کے بعد سٹر بکرنے پھر پروفیسری قبول کر لی تھی۔ ان کا ۳۳ عہد میں انتقال ہوا۔

مشرقی ذخائر کی سرگزشت | ابتداء سے عیسائیت کو اسلام سے رہابت رہی ہے اور یہ گویا عیسائی پادریوں کے فرائض میں داخل تھا کہ جس طرح چاہیں اسلام اور آنحضرت صلعم کو بدنام کریں۔ قرون وسطیٰ میں یورپ نے اس موضوع پر اس قدر لڑ پچرتیا کر کیا کہ دو فرانسیسی مصنفوں کی کتاب Roman de Moamet آج تک مشہور ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کے خلاف جملہ اتہامات کو جمع کر کے انہیں ایک انتہائی دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں اب تک اسلام کے متعلق عجیب و غریب روایات مشہور ہیں۔

لیکن جب سے کہ یورپ تہذیبی اور تمدنی حیثیت سے ترقی کرنے لگا تو اسلام کے خلاف ایک دوسرا تہذیبی حربہ اختیار کیا گیا۔ اور یہ اسلامی ادبیات کی طرف توجہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپین ممالک کا رفتہ رفتہ مشرق پر تسلط بڑھتا جا رہا تھا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مشرقی علوم و فنون کی کتابیں حاصل کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اس کے بعد دوسرا قدم جو اٹھا وہ اسلامیات کی تعلیم کے لئے مدارس اور درس گاہوں کا قیام تھا۔ اس معاملہ میں ہالینڈ سب کا پیشرو ہے جس کا سب سے پہلے جاوا پر قبضہ ہوا۔ ان مدارس کے ذریعہ تحصیل طلباء نے جو عام طور پر دینیات کے طالب علم ہوا کرتے تھے، اسلام پر علانیہ اعتراضات شروع کئے لیکن زمانہ کے حالات بدلنے سے یہ طریقہ بھی کارگر

ثابت نہیں ہوا اور مختلف سائنٹفک ادارات اور ایشیائی سوسائٹیاں قائم کر کے علمی پیرانیہ میں اسلام پر کتبہ یعنی کج مانے لگی۔ آج یورپ میں مشرقی اور اسلامی علوم کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے مسلمان طلباء وہاں جاتے ہیں۔ یہ دراصل وہ کامیابی ہے جو یورپ نے ہماری ذہنیات پر حاصل کی ہے۔

میتونک میں جو بویریا کا صدر مقام ہے تحقیقات قرآنیہ QWRAUC RE SEARCH کے نام سے فن قراءت، تفسیر اور دیگر علوم قرآنیہ کے متعلق ایک زبردست ادارہ ہے جس کے تحت قرآن مجید کے رسم الخط، اعاب اور اسلے کی غلطیوں اور دیگر اختلافات کو بڑے اہتمام سے جمع کیا جا رہا ہے اور ابتدائے اسلام سے اب تک قرآن مجید کے جتنے نسخے دنیا میں رائج ہیں ان کے حاصل کرنے کے لئے اس ادارہ کے پروفیسر مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کر رہے ہیں۔ اس ساری تحقیقات اور تلاش کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن مجید الہامی کتاب نہیں ہے۔ کیونکہ اب تک عیسائی دنیا قرآن مجید کو آنحضرتؐ کی تصنیف ثابت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ غرض یورپ میں اسلامیات سے دلچسپی کی یہ سرگزشت ہے اور اس کے مقابل میں ہمارا جمود ظاہر ہے۔

نازی تحریک | جرمنی میں نازی تحریک کی وجہ سے قومی برتری کا خیال شدہ دہ سے پیدا ہو گیا ہے اور اس کا وبال سب سے زیادہ یہودیوں پر پڑا جو اپنی نام نہاد قومی خصوصیات اور قوم کی وجہ سے ملک کے معاشی و اقتصادی حالات پر چھانے ہوئے تھے۔ عدالت، طبابت،

وکالت، صحافت، سینما غرض ذرائع آمدنی کی ساری چیزیں یہودیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ جنگ عظیم نے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی ہر حیثیت سے جرمنی کو تباہ و برباد کر دیا لیکن یہودی اس سے غیر متاثر رہے۔ ہندالک میں اس کا ردِ عمل پیدا ہونا ضروری تھا اور یہ ردِ عمل نازی تحریک ہے۔ اس تحریک کا اولین مقصد معاہدہ ورسائی کو کالعدم کر کے جرمن قوم کے ساتھ جو نا انصافیاں کی گئیں ان کا انتقام لینا ہے۔ صلح کے بعد سے خود حکومت بھی خفیہ طور پر فوجی تسلیم و تربیت کی طرف راغب تھی اور یہ امر اس کے پیش نظر تھا کہ معاہدہ ورسائی سے سب کچھ ہو لیکن ملک میں جہانی انحطاط نہ پیدا ہو۔ اس غرض کے لئے ملک میں بیسیوں ادارے قائم ہوئے۔ سیول ہوا بازی کے نام سے ہوائی قوت حاصل کی گئی۔ خود ہٹلر کی نازی جماعت کا حال ایک باقاعدہ فوج کا سا تھا کیونکہ اس میں اکثر جنگ کے درخواست شدہ فوجی شریک تھے۔ جس وقت نازیوں کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی تو یہ جماعت حکومت کی علانیہ مخالفت پر اتر آئی۔ غرض دس سال کی پیہم سعی و کوشش کے بعد پارلیمنٹ میں نازی جماعت نے غیر معمولی قوت بہم پہنچائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے ہینے وزارت تبدیل ہو رہی تھی اور حکومت سے بددلی پیدا ہونے لگی تھی۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں پہلی مرتبہ ہٹلر کو قیام وزارت کی دعوت دی گئی جس کے ساتھ ہی ملک میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اٹل نے اپنے ایک پرو فیسر کا قصہ بیان فرمایا جو ہٹلر اور نازی تحریک کے بدترین مخالف تھے لیکن وزارت کے اعلان کے ساتھ ہی انھوں نے جماعت میں ہٹلر کی تعریف و توصیف کا قصبہ دھڑکا۔

اس معاملہ میں بیچارے ہندوستانی مفت بدنام ہیں۔

نازی حکومت نے قومی اشتراکیت کے اصول پر نئے نئے قوانین نافذ کئے جس کے بموجب مملکت کو ہر معاملہ میں فوقیت دی گئی اور اس کے لئے ایک نئی اصطلاح Totalitarian وضع کی گئی۔ سب سے پہلے پریس پر احتساب قائم ہوا اور اس کو حکومت کی تائید پر مجبور کیا گیا۔ یہودی سرکاری ملازمت سے علیحدہ کئے گئے۔ ان کی تجارت اور کاروبار کا مقاطعہ کیا گیا اور ان کی دکانوں پر چوکیوں کی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی ہفتوں میں سینکڑوں یہودیوں نے دیوالہ نکال دیا۔ بالآخر انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور عام طور پر یہ قانون نافذ کر دیا گیا کہ کوئی شخص جرمنی چھوڑتے وقت اپنے ساتھ ایک ہزار پونڈ سے زائد نہیں لے جاسکتا۔ آج کل یہ قواعد اور بھی سخت کر دیئے گئے غرض اس طرح ملک کی معاشی اور اقتصادی حالات پر قابو حاصل کیا گیا۔

چونکہ معاہدہ ورسائی سے جرمنی میں اسلحہ سازی اور فوجی قوت پر تحدید قائم کی گئی تھی لہذا اسلحہ ہوا بازی کو ملک میں غیر معمولی فروغ دیا گیا اور ایسے ہوائی جہاز بنائے جانے لگے جو باآسانی جنگی جہازیں تبدیل ہو سکتے تھے۔ علاوہ انہیں خفیہ اسلحہ سازی کی طرف توجہ کی گئی اور دو سال کی قلیل مدت میں جرمنی کی جنگی قوت فرانس کے برابر ہو گئی۔

ابتدا ہی سے حکومت کے پیش نظر ملک کی معاشری اور اخلاقی اصلاح کا بھی مسئلہ تھا۔ چنانچہ برہمنہ کلب بند کر دیئے گئے، تھیٹروں میں عریاں مظاہر کی ممانعت کی گئی اور یہ مشہور کیا گیا کہ یہ سارے یہودی ادارے تھے۔

اُن تمام عورتوں کو ملازمت سے علیحدہ کیا گیا جن کے شوہر برسرِ کار تھے۔ ملک کے ہر اخبار میں پروپگنڈے کے طور پر یہ سرخی قائم کی گئی۔ جرمن عورت سگریٹ نہیں پیتی، ”ورنہ جنگ کے بعد عورتوں میں سگریٹ اور منشیات کا عام رواج ہو گیا تھا۔

مختصر یہ کہ نازی تحریک سے جرمنی کے تین مردہ میں جان پڑ گئی۔ لیکن جرمن قوم ساری دنیا میں بدنام ہو گئی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں نے جو اکثر یورپی ممالک و امریکہ میں صحافت پر چھانے ہوئے ہیں جرمنی کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ یورپی ممالک کو جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے خلاف دنیا کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کا بڑا ترین موقع ہاتھ آیا۔

جرمنی کی یہ ترقی تاویخ عالم کا ایک زبردست واقعہ ہے کہ کس طرح ایک مفلوک الحال قوم جو تباہی کی سرحد کو پہنچ چکی ہو محض اپنے عزم و استقلال کے بل بوتے ایک قلیل عرصہ میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر کے پھر از سر نو دنیا کی طاقت و ترین قوت بن جاتی ہے۔

عورت | فرانس میں عورتوں کو بناؤ سنگا رکا بڑا شوق ہے۔ آئے دن فیشن میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس معاملہ میں انگریزی عورتیں بہت پیچھے ہیں البتہ لباس کی حد تک ان کے مرد و عورت اور فیشن کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انگلستان میں ادھیڑ اور بوڑھی عمر کی عورتوں کو چہرے پر غازے اور سرخیاں لگانے کا بڑا شوق ہے۔ فرانس کی

عورتوں کے بناؤ سنگسار سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بد اخلاق ہوتی ہیں۔ یورپ کے دارالسلطنتوں میں پیرس کے شرفاء کی زندگی بہترین ہے اور انگلستان کے مقابلہ میں عورتوں کا کردار زیادہ تر عفت آبادی کی طرف مائل ہے۔ فرانس میں ایک کنواری لڑکی بجز مدرسہ یا کالج جانے کے باہر تنہا نہیں جاسکتی، اس کے کسی قریبی عزیز کا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ یا جامعہ کی طالبات اخلاقی معاملات میں اپنے آپ کو زیادہ پابند نہیں سمجھتیں۔ تعلیم آزاد خیالی اور عمر کے تجاوز کر جانے سے عصمت کا تصور باقی نہیں رہتا۔ ضبط تولید کے انگلستان میں زیادہ حامی ہیں۔ فرانس، جرمنی اور اطالیہ میں کثرت اولاد کی تحریک کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔

اطالیہ میں ایک نوجوان عورت کا تنہا سفر کرنا بے حد مخدوش ہے۔ ڈاکٹر جمید اللہ کے ایک دوست کی منیگریتر اپنے والد کے انتقال کی وجہ سے اپنا غم غلط کرنے دیرھ دو ماہ کے قیام کے ارادہ سے اطالیہ گئی تھی لیکن پندرہ روز ہی میں وہ واپس آگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم رومنوں کی شہوت پرستی اب تک وہاں کے چہ چہ میں سرایت کی ہوئی ہے۔

فرانس میں لوگ کثرت سے شراب پیتے ہیں حتیٰ کہ چھوٹی عمر کے بچے بھی دھت نر کے شیدائی ہیں۔

معیار زندگی | یورپ کا معیار زندگی بہت بلند ہے اور یہ محض دولت کی فراوانی کی وجہ سے انگلستان میں ادنیٰ ملازمین کی تنخواہیں معقول ہوتی ہیں جس سے احساس فرض و دیانت باقی رہتا ہے۔ یورپ میں

ایک ٹائپسٹ عورت کو آدھا دو سو روپیے ماہوار ملتے ہیں۔ لیکن خچ کا بھی یہی حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک مرتبہ اپنی شیروانی کی دہلوائی کے لئے تقریباً پانچ سو روپیہ ادا کرنے پڑے تھے۔ وہاں کے ادنیٰ ادنیٰ لوگوں میں جو دیانت اور اپنے فرائض کا احساس ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ بتوں (جرمنی) پہنچنے کے قبل ڈاکٹر صاحب کو کوٹون اسٹیشن پر ریل تبدیل کرنی پڑی۔ آپ نے قلی کو تین ڈاک اٹھانے کی اجرت ایک مارک (= یکصد فنش) دی۔ یہ جانتے ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب اجنبی ہیں قلی نے اپنی حقیقی اجرت لیکر (۰.۱) فنش واپس کر دیئے۔

خصوصیات ذاتی | یورپ کے ہر ملک کے حالات دوسرے سے مختلف ہیں جرمنی میں ڈسپلن بہت زیادہ ہے اور لیڈر کی اندھا دہند

تقلید کی جاتی ہے۔ فرانس میں انفرادیت زیادہ ہے۔ فرض شناسی اور باقاعدگی انگریزوں کی گھٹی میں پڑی ہے جس کی وجہ سے یہ قوم زندہ بھی ہے۔ بیسکن ہمان نوازی، ہمدردی اور عام اخلاق میں کوئی ملک جرمنی سے بازی نہیں لیجا سکتا۔ اس کی توضیح ڈاکٹر حمید اللہ نے ان واقعات سے فرمائی۔ پہلی مرتبہ آپ بون رات کے بارہ بجے پہنچے۔ آپ یہاں کسی سے واقف نہیں تھے۔ آپ کی پریشانی کو دیکھ کر آپ کے ایک ہم سفر نے ایک ہوٹل میں لیجا کر ٹھرایا اور سارے انتظامات کر دیئے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے جو جملہ کہا اس نے ہمیشہ کے لئے آپ کو اس شخص کا ممنون احسان کر دیا۔ اگر آپ میرا شکر یہ ادا کرنا تو مجھے تکلیف ہوگی۔

اسی طرح اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب آپ بتوں سے روانہ ہونے لگے تو

ٹرین رات کے تین بجے نکلتی تھی لیکن آپ کے پروفیسر آپ کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔ اس کے برعکس فرانس میں آپ کا ایک سال سے زائد قیام رہا لیکن کسی پروفیسر نے ایک وقت بھی آپ کو چار پر مدعو نہیں کیا حالانکہ بون میں آپ اکثر پروفیسروں کے پاس ڈنر پر مدعو رہا کئے۔

فرانس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور محاصل زیادہ ہیں۔ اسی لئے آسانی سے لوگ قوم فروشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آئے دن وہاں راز کی کارروائیوں کا انشا ہوتا رہتا ہے۔

جرمنی میں کسی غیر ملکی کا تین ماہ سے زائد قیام رہے تو پولس میں اپنا پتہ لکھانا پڑتا ہے، فرانس میں بھی یہی اصول ہے۔ علاوہ ازیں وہاں ایسے اشخاص کو ننگے سر اپنی پانچ تصویریں داخل کرنی پڑتی ہیں۔ فرانس میں متوطن ہونے کیلئے فیس مقرر ہے۔ طالب علموں کو جو کس طرح کماتے ہوں (۲۰) فرانک ادا کرنے پڑتے ہیں۔

مذہب | مذہبیت سب سے زیادہ اطالیہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد فرانس ہے جہاں گرجے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں کے گرجوں میں کرسیوں پر بیٹھنے والوں سے کچھ رقم بھی بطور محصول وصول کی جاتی ہے۔ جرمنی میں بھی راسخ الاعتقاد کی زیادہ ہے انگلستان میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح لوگ اپنے آپ کو مذہب پرست کہتے ہوئے شہرتے ہیں۔ لیکن مذہب کے یڈر بڑے پکے ہوتے ہیں انگریزوں نے سیاست میں ظاہر داری کا جو سبق سیکھا ہے وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر

حاوی ہے۔

برتری کے اسباب ہر قوم کی ترقی کا ایک زمانہ ہوتا ہے جس کے لئے قدرتا کچھ اسباب بھی ہنسیا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں کا ہندوستان پر جیسا

قبضہ ہوا اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی (۱۲۰۰) کی ایک قلیل جماعت نے محض اپنے عزم و استقلال سے اسپین پر فتح حاصل کی تھی اور (۸۰۰) سال تک مسلمان وہاں حکمران رہے۔ یورپ اور مسلمانوں کی ترقی کا مقابلہ کرتے وقت یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں نے اس وقت ترقی کی جب ان کے پاس ایک خاص تہذیب تھی یعنی اسلامی تعلیمات۔ لیکن یورپ میں تہذیب و تمدن اس وقت پیدا ہوا جب مادی حیثیت سے یورپ نے خاطر خواہ ترقی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ابتدا ہی سے اخلاق، رواداری، ہمدردی اور دیگر خصوصیات میں دنیا کے سامنے مجسم نمونہ بن کر پیش ہوئے اور یورپ میں یہ چیزیں اس وقت شروع ہوئیں جب اس نے ترقی کے جلد منازل طے کر لئے۔

قابل تقلید خصوصیات ہر ترقی یافتہ قوم میں بعض خصوصیتیں قدرتا پیدا ہو جاتی ہیں بکار و بار کی ترقی کے لئے اس

بات کی ضرورت ہے کہ معاملہ اچھا ہو۔ فوج کے لئے ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ سیدل سرویس میں شخصی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جو فوجان یورپ جاتے ہیں انہیں اپنے ملک کا اچھا نمونہ بن کر پیش ہونا چاہیئے اور نمونہ ہمیشہ نصیحت سے بہتر ہوتا ہے۔ حیدر آبادی اور خصوصاً سرکاری طور پر جانے والے طلباء

متعلق براعظم میں مشہور ہے کہ یہ بڑے سُرف ہوتے ہیں۔
یورپ کا مستقبل ہر قوم اور تمدن کے لئے ترقی اور تنزل لازم و ملزوم ہیں۔
 اور یہ قانون قدرت ہے۔ مسلمانوں کو باوجود اپنی اعلیٰ
 تہذیب و تمدن کے اسپین خالی کرنا پڑا۔ ممکن ہے ایک دن یورپ کو بھی اسی
 قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ یورپ کی ترقی اس کی عالمگیر قوت کا
 نتیجہ ہے اور اس کی یہی قوت اس کی تباہی کا باعث بھی ثابت ہوگی۔ زوال کی دوسری
 وجہ جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے وہ آپس کا نفاق ہے اور یورپ آج کل
 نا اتفاقیوں کا اکھاڑ بنا ہوا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یورپ غیر محسوس طور پر
 اسلام کی آغوش میں آ رہا ہے۔ عقائد اور معاشرتی دونوں حیثیتوں سے۔
 یورپ میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی دو بڑی خلیجیں موجود ہیں اور ان میں اتنا
 صرف ذکاوت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اشتراکیت قانون فطرت کے خلاف ہے۔
 اس میں انسان کی تخلیقی قوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

خود یورپ اپنے مستقبل کے متعلق امید افزا نہیں ہے۔ یورپ کے مفکرین
 آئندہ کے متعلق بڑے یاس انگیز خیالات رکھتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ "تیار
 رکھو اپنے مخالفین کے لئے جہان تک ہو اپنی قوت کو" جس کا مفہوم انگریزی میں
 (Be Prepared) ہے۔ اور جو قوم تیار رہے گی وہ زندہ بھی رہے گی۔

مولوی محمد صدیق صاحب

مولوی محمد صدیق صاحب ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ہندوستان میں کافی مشہور ہیں۔ آپ بمبئی کرائیکل، ڈیلی کرائیکل اور نمینیل ہیرلڈ کے چیف سب ایڈیٹر تھے۔ اول الذکر اخبار کی ہفتہ وار اشاعت اور فری پریس نیوز سرویس کی شاخ دہلی کے آپ ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ کچھ دنوں سے آپ ایک طرح صحافت سے کنارہ کش ہو گئے ہیں لیکن جید رآباد کے سیاسی معاملات میں آپ کی پُر غلوص دلچسپیاں ناقابل فراموش ہیں۔ سلسلہ میں شاہ جارج ششم کی تاج پوشی کے وقت آپ انگلستان دو ماہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

انگریزوں کی ذہنیت | انگریزوں کی ذہنیت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ہر انگریز کا یہ ایقان ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان پر ایسا مستحکم قبضہ ہے کہ ہندوستان کی کسی قسم کی سیاسی شور و شر

اس تسلط میں ذرا بھی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انگریز اپنی فوجی قوت پر نازاں ہیں بلکہ گنجفہ کے ایک اچھے کھلاڑی کی طرح ان کے ہاتھ میں جتنے بھی پتے ہیں ان کو وہ بہترین طریقہ پر کھیلنا جانتے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے وہ جو بھی چال چلتے ہیں وہ بہترین ہوتی ہے۔ ہندوستانی ذہینتوں کا انہوں نے اس غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ ان کے لئے غلطی کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی سیاسی تحریک یا قومی مطالبات میں کامیابی محض ایک چیز سے ہو سکتی ہے اور وہ بین الاقوامی صورت حال ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگریز ہندوستانی لیڈروں میں گاندھی جی سے

زیادہ پنڈت جواہر لعل سے خائف ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی صوبوں میں صوبہ سرحدی اور بنگال کے نام خوف و دہشت سے لئے جاتے ہیں کیونکہ ایک بہیمیت کے لئے مشہور ہے اور دوسرا مزاجیت کے لئے ہندوستان سے متعلق اگر کسی سے گفتگو ہو تو پہلے سرحد کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے اتنی ہی اس کی عزت بھی کرتا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ فینسی ڈریس بال میں سرحد کے مرد یا عورت کے سوانگ بھرنے والے عام طور پر انعامات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

انگلستان میں طبقہ داری تعصب بہت ہے معمولی طبقہ داری تعصب | طبقہ کے لوگ اپنے طبقوں میں آزادی سے گھل مل نہیں سکتے۔ ہندوستانیوں سے عام طور پر تعصب برتا جاتا ہے اور

فصل و شبابہت کے حوالہ سے رقم کے بھول جانے کا اعلان کیا گیا اور اس طرح یہ رقم حاصل ہوئی۔

کفایت شعاری | انگریز انتہائی کفایت شعار اور سادگی پسند ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو انگریز ہندوستان میں ایک شاندار زندگی بسر کر کے وطن واپس لوٹتے ہیں ان میں بھی ”صاحبیت“ باقی نہیں رہتی۔ اس کی توضیح اس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے زمانہ تاجپوشی میں حیدرآباد کے ایک سابق انگریز عہدہ دار کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا جس میں اکثر غائد مدعو تھے۔ لیکن مسٹر صدیق نے حیرت سے دیکھا کہ معزز مہمان جن کے لئے سارا انتظام کیا گیا تھا چہتری بغل میں دبّا ایک بس سے اتر کر دعوت میں شریک ہوئے۔

ملاقاتیں | زمانہ قیام لندن میں مسٹر صدیق نے انگلستان کے اکثر اہل الرائے اور سربراہ آوردہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں جن میں قابل ذکر ارل ہالڈ (وزیر اعظم وقت) جارج لانسبری، براکوے، بریلیس فورڈ (مشہور مصنف) سرفرڈیکا سائیکس، سر ریچنا لڈ گلکلسی و سمرارنٹ ہڈسن ہیں۔

ارل ہالڈون | الیڈالڈون سے آپ کی بالکل اچانک اور اتفاقیہ طور پر انڈیل کینرل میں ملاقات ہوئی جہاں آپ ایک دعوت میں شریک ہونے گئے تھے یہیں وزیر اعظم و وایک روز کی تعطیلات بسر کر رہے تھے۔ غالباً وقت سے کچھ پہلے پہنچنے کی وجہ سے مسٹر صدیق تنہا اس قدیم محل میں گھوم رہے تھے کہ آپ کی نظر وزیر اعظم پر پڑی جو اپنی اہلیہ کے ساتھ بالاخانہ سے نیچے اتر رہے تھے۔

ایک جرنلسٹ سے کہیں ایسے موقعوں پر غلطی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے فوراً پیش قدمی کر کے اپنا آپ تعارف کرایا اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں جس وقت ارل بالڈون نے فرمایا کہ وہ آرام کی خاطر اس محل میں فروکش ہیں تو سٹرصدیق نے میساختہ ہنستے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو آرام کے ساتھ ساتھ شہنشاہیت کی خدمت کا بھی خیال ہے تو اسٹریسے بنکر ہندوستان تشریف لائیں۔ ارل بالڈون نے اس جملہ پر ایک تہقہہ بلند کیا۔

لانسبری | جارج لانسبری لیڈر حزب الاختلاف و سابق وزیر سے ملاقات کرنے میں سٹرصدیق کو پہلی مرتبہ بڑی دقت پیش آئی کہ وقت مقرر ہو چکا تھا اور وقت سے کچھ پہلے ہی آپ ایک ٹکسی میں روانہ بھی ہوئے تھے لیکن تاجپوشی کے زمانہ میں سڑکوں پر اتنی غیر معمولی آمد و رفت تھی کہ وقت مقررہ کے دو گھنٹے بعد بھی آپ کا منزل مقصود پر پہنچنا ناممکن تھا۔ آپ نے شوفر سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا جس نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً زمین دوڑا تے سے جائیں۔ اس طرح آپ ٹھیک وقت پر جارج لانسبری کے مکان پر پہنچ سکے۔ لیکن اس ملاقات سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی اور جب آپ نے اس کا اظہار کیا تو لانسبری نے کسی صبح اپنے ساتھ چہل قدمی کرنے کے لئے کہا کیونکہ یہی اس کی سب سے بڑی فرصت کا وقت ہوتا ہے چنانچہ سٹرصدیق کو انگلستان کی اس زبردست شخصیت سے دل کھول کر ملنے کا اتفاق ہوا۔ چہل قدمی سے واپس ہوتے وقت لانسبری نے آپ کو لائنس کافی ہونڈ میں اپنے ساتھ کافی پلائی۔ سٹرصدیق کا بیان ہے کہ یہ کافی گھراتا معمولی تھا کہ کم از کم حیدرآباد کے اوسط قسم کے عہدہ دار بھی ایسی جگہ آنا اپنی کسرشان سمجھینگے۔

لارڈ ہیلی فاکس | لارڈ ہیلی فاکس سابق وائسرائے ہند (حال معتمد امور خارجہ برطانیہ عظمیٰ) سے بھی آپ کی ایک دلچسپ مٹ بھیڑ ہوئی۔ قصر بکنگھم میں انڈین کنٹینٹ کی دعوت تھی جس میں باہر کے بھی بہت سے لوگ مدعو تھے۔ انگلستان میں عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ کسی بڑے مکان میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اور بڑا کوٹ ملازم (Valet) کے حوالہ کر دینا پڑتا ہے جو سلسلہ دار انھیں محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہاں بھی ”کیو“ کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مسٹر صدیق کے پیچھے لارڈ ہیلی فیکس اپنی باری کا انتظار کرتے کھڑے تھے۔ ایک سابق وائسرائے ہند کی اس سے بڑھکر اور کیا عزت کی جاسکتی تھی کہ مسٹر صدیق نے انہیں اپنی جگہ پیش کی۔ لیکن لارڈ صاحب نے یہ کہتے ہوئے انکار فرمایا کہ یہ انگلستان ہے ہندوستان نہیں۔



نظر کے دھوکے

از

بدز شکیب

مصنف کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے بہ اعتبار فن اور بلحاظ دلکشی و رنگینی انتہائی دلچسپ ہیں جن کو ملک کے مشہور آرٹسٹ مسٹر قیوم نے مصور کیا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ بہترین قیمت پر افسانوں سے متعلق ذیل کی تنقیدیں ملاحظہ ہوں: ہر افسانہ اس مجموعہ کا دلچسپ ہے۔ پلاٹ کی برجستگی، اسلوب روزنامہ روبرو کن بیان کی دلکشی ان کو نہایت درجہ دلپذیر اور سبق آموز بنادیتی ہے۔

یہ افسانے ہر لحاظ سے نہ صرف اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں بلکہ ہمارے نوجوان ادیبوں کو اس بات کا درس بھی دیتے ہیں کہ تخیل کی دنیا محض بیرونی ادب سے متاثر ہو کر بے سرو پا تحریروں کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنے ماحول میں بس کر اس سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔

یہ افسانے پلاٹ کے لحاظ سے عمدہ اور طرز بیان کے رسالہ ”ساقی“ دہلی اعتبار سے دلکش ہیں۔ بعض افسانے مقامی رنگ کی

وجہ سے خاص نوعیت رکھتے ہیں ”گشہ لاش“ اور ”عارضی شوہر“ بہت کامیاب افسانے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورِ ایم۔ اے۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) [پروفیسر اردو جعنا]

یہ افسانے زیادہ تر اچھی ہیں اور مصنف کے تخیل کی پیداوار ہیں۔ ان کا اسلوب صاف و سلیس ہے اور ان میں حیدر آباد کی زندگی کو نہایت دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی ملک کو ضرورت ہے جن میں زبان کی لطافت اور اسلوب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے اخلاق و عادات پر نہایت صحیح نقطہ نظر سے تبصرہ کیا جائے۔

یہ کتاب فنِ فسانہ نویسی کے معیار سے بھی بہت بلند پایہ ہے۔

مشہور مصنف فنانکار عبدالقادر سروری ایم۔ اے۔ ال۔ بی۔ (لکچرار جعنا)

اس مجموعہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عام اردو قصوں کے مقابلہ میں یہ مجموعہ ایک نئی فضا پیش کرتا ہے۔ افسانوں میں ادبیت اور افسانہ دونوں کی دلچسپیاں موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں تمام قصے عشق و تعشق اور ہم پسندی سے مالا مال نظر آتے ہیں۔

مشہور مصنف ادیب سید محمد ایم۔ اے۔ افسانے لکھے ہیں جن میں سے زیادہ تر

اُن کے اپنے طبع زاد ہیں۔ ان افسانوں میں حیدر آبادی معاشرت اور تمدن کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی کتابوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ نظر کے دہو کے واقع میں بہت نظر فریب اور دلکش ثابت ہونگے۔

مکمل
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

